خطباتِ عیدین

محمد تقی امینی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

خطباتِ عیدین

مولانا محمد تقی امینی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025
شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

پہلی بار دسمبر ۱۹۸۳ء　　تعداد 750　　قیمت: 21/-

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی

فہرست

مقدمہ

دہلی۔ ناگپور۔ اجمیر اور لکھنؤ قیام کے بعد ستمبر ۱۹۶۴ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ آیا اسی وقت سے یونی ورسٹی کی جامع مسجد میں جمعہ و عیدین کے خطاب کا سلسلہ جاری ہے یہ خطاب وعظ کی شکل میں نمازِ جمعہ سے پہلے ہوتا ہے ادھر چند سالوں سے عیدین کے خطاب کا معمول تحریری ہو گیا ہے یہ مجموعہ ۱۹۸۳ء تک انھیں پر مشتمل ہے جو عید و بقرعید کے موقع پر نماز سے پہلے لوگوں کو پڑھ کر سُنائے گئے۔

جمعہ و عیدین کے خطاب سے سامعین کو کس قدر فائدہ ہوتا ہے، اس کا اندازہ میرے لیے حد درجہ مشکل ہے سامعین کی تعداد کو دیکھ کر خوش فہمی میں مبتلا ہونے کا میرا معمول کبھی نہیں رہا پھر یونی ورسٹی کے سامعین جن میں ایک سے ایک فنکار و علم و دانش کے علم بردار موجود ہوتے ہیں اور جن کے سمجھنے کے لیے میرے قیام کے ۱۸۔۱۹ سالہ تجربات بھی ناکافی ثابت ہوئے ہیں۔ ....—

ہمارے علما جو یہاں کے حالات سے واقف نہیں ہوتے ہیں ان کی اگر دو چار تقریریں ہو گئیں یا دو ایک کمیٹیوں کے ممبر بنا لیے گئے تو وہ بڑی آسانی سے خوش فہمی میں مبتلا ہو کر سمجھ لیتے یا ان کے

معتقد بن سمجھا دیتے ہیں کہ "یونی ورسٹی فتح ہوگئی" حالانکہ انھیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ سب بندوبست صرف ان کی دعا کے لیے ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ واقعہ ہے کہ کسی قوم کے تہوار اس کی زندگی، خصوصیت اور تہذیب و شرافت کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے عید و بقرعید بھی مسلم قوم کے آئینہ دار ہیں اور اسی لحاظ سے ان خطبات کا مطالعہ مناسب ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ان کو قبول فرمائے اور لوگوں کو فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے — آمین۔

محمد تقی امینی
یکم جولائی ۱۹۸۳ء

ادارہ علم و عرفان
امینی منزل دودھ پور روڈ علی گڑھ

یہ ہے ہماری تہذیب

حضرات! کسی قوم کی تہذیب و شرافت کا اندازہ اس کے قومی تہوار سے ہوتا ہے، عید مسلمانوں کا سب سے بڑا قومی تہوار ہے جس کی ہر ادا میں ندرت ہے، دنیا کی دوسری قوموں کے تہوار ان کے لیے ہر طرح کی آزادی اور عیش و عشرت کے دن ہوتے ہیں چنانچہ گانا بجانا، ناچ رنگ، شراب کباب، پچکاریاں، ہلڑ بازی مردم آزاری اور گالی گلوج وغیرہ سب کا اس دن مظاہرہ ہوتا ہے۔

لیکن عید کی ہر حرکت و عمل سے صفائی، ستھرائی، شرافت و شائستگی عظمت و بڑائی وحدتِ انسانی اور مساوات کا اعلان ہوتا ہے۔

عید کا نعرہ ہے

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ

اللہ سب سے بڑا ہے وہ صاحب عظمت ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اللہ سب سے بڑا ہے ساری تعریفیں صرف اللہ کو زیبا ہیں۔

یہ تقریب اللہ کے نام سے شروع ہوتی ہے اور اللہ ہی کے نام پر

ختم ہوتی ہے، ہر مسلمان صاف ستھرے پاکیزہ کپڑے پہنے اللہ اکبر اللہ اکبر الخ کہتا ہوا عیدگاہ یا جامع مسجد کی طرف جاتا ہے وہاں حاضر ہو کر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتا ہے اور مصافحہ و معانقہ کر کے ہر ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کرتا ہے پھر نہایت سنجیدگی و متانت کے ساتھ اللہ اکبر اللہ اکبر الخ کہتا ہوا اپنے گھر واپس آتا ہے، گھر میں شیر خرما اور دوسری لطیف چیزوں کا اہتمام ہوتا ہے جس سے آنے والوں کی خاطر تواضع کی جاتی ہے، نماز کے لیے جانے سے پہلے کچھ غلّہ یا نقد رقم پڑوسیوں اور محلہ کے غریبوں میں تقسیم کرنے کا حکم ہے تاکہ فراغت کے ساتھ سب لوگ عید کی خوشی میں شریک ہو سکیں۔

عید کے دن اللہ اکبر کا نعرہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مسلمان کی سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ اس کی محفل نشاط میں بھی اللہ کا نام بلند کیا جائے جس کے صلہ میں ملّت کا نام بلند ہو، اسی اللہ کے نام سے مسلم زندگی کی ابتدا ہوتی ہے اور اسی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے، چنانچہ پیدائش کے بعد بچّے کے کان میں جو سب سے پہلی آواز پڑتی ہے وہ اللہ اکبر کی ہوتی ہے اور مرنے کے بعد سب سے آخری آواز لا الٰہ الا اللہ کی ہوتی ہے، زندگی کے ہر لمحہ میں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے سبحان اللہ، الحمد للہ بارک اللہ جزاک اللہ، رحمۃ اللہ وغیرہ الفاظ زبان پر جاری رہتے ہیں جو اس بات کا اعلان ہیں کہ مسلم کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر کام خالص اللہ کے لیے ہے۔

اِنَّ صَلوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو

سارے جہان کا پروردگار ہے۔

مسلم زندگی کا سب کچھ اللہ کے لیے ہے کہ اسی میں اس کی ترقی و سر بلندی کا راز پوشیدہ ہے

نمود اس کی نمود تیری ۔۔۔ نمود تیری نمود اس کی
خدا کو تو آشکار کر دے ۔۔۔ خدا تجھے آشکار کر دے

عید سے چند دن پہلے ایک دن عصر کے بعد جب گھر میں داخل ہوا تو میری بچی سعیدہ سلمہا اپنے چھوٹے بھائی کو لوریاں دے رہی تھی اور بڑی لَے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

حسبی ربی جل اللہ۔ مافی قلبی غیر اللہ نور محمد صلی اللہ لا الہ الا اللہ
"میرا رب مجھ کو کافی ہے، وہ بزرگ و برتر ہے، میرے دل میں اللہ کے سوا کوئی نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ساری دنیا کو روشنی پہنچاتا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں"۔

معصوم بچی کی سریلی آواز سے یہ الفاظ اپنے اندر مزید کشش پیدا کیے ہوئے تھے۔ جن کو سُن کر میں بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ کس طرح اس تہذیب کے رگ و ریشہ میں اللہ کی توحید اور شرک کی نفی سرایت ہے۔ شرک کے معاملہ میں اسلامی تہذیب کا احساس حد درجہ نازک ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے مومن کے قلب کو سب سے بڑا اعزاز عطا کیا ہے جو دنیا میں کسی کو بھی میسّر نہیں وہ یہ کہ ساری دنیا کو نظر انداز کر کے صرف قلب مومن کو اس نے اپنا جلوہ گاہ بنایا ہے۔

لَا یسعنی اِلَّا قَلبُ مُؤمِن (الحدیث)
میری سمائی بجز مومن کے دل کے اور کہیں نہیں ہو سکتی،

اس انتخاب کے بعد اللہ کی غیرت کو یہ گوارا نہیں کہ دل میں کسی

اور کو جگہ دی جائے کہ اس کا کچھ حصہ اللہ کے لیے ہو اور کچھ دوسرے کے لیے ہو تقسیمِ دل کو دنیا کا کوئی قانون برداشت نہیں کرتا، حکومت کو بغاوت گوارا نہیں کہ اس میں تقسیمِ دل ہے، عاشق کو رقابت گوارا نہیں کہ اس میں تقسیمِ دل ہے، پھر اللہ کو شرک کیوں کر گوارا ہو کہ اس میں بھی تقسیمِ دل ہے جس آمیزش کو مادّی چیزیں برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں اس کی غیر مادّی چیزوں سے کیوں کر توقع کی جاسکتی ہے اور پھر اللہ کی ذات تو سب سے اعلا وارفع ہے؟

عید ہمارے لیے انتہائی خوشی کا دن ہے لیکن اس خوشی کو منانے کے لیے ملّت کے بزرگوں سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

زَيِّنُوا الْعِيدَ بِالتَّهْلِيلِ وَالتَّكْبِيرِ وَالتَّحْمِيدِ وَالتَّسْبِيحِ۔ "تم عید کو لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر، الحمد للہ، سبحان اللہ، سے زینت دو۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے گھر عید

عام طور پر تہوار کے دن جو جس حیثیت کا ہوتا ہے اس کی مناسبت سے اس کے یہاں جشن منایا جاتا ہے لیکن وقت کی سب سے بڑی حکومت کے سربراہ امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے یہاں عید کا جشن جس طرح سے منایا گیا اس کی نظیر شاید دنیا کی تاریخ میں نہ مل سکے۔

عید قریب آرہی ہے اور محلّہ کے ہم جولی لڑکوں کے رنگ برنگ

کپڑے بن رہے ہیں جنھیں دیکھ کر عمر بن عبدالعزیز رح کے صاحبزادے دوڑے ہوئے گھر آئے اور معصومانہ انداز میں اپنی ماں سے گفتگو کی،

ایک نے کہا:

اماں عید میں ہم بھی نئے کپڑے پہنیں گے کیا آپ نے جریر اور مغیث (محلہ کے ہم جولی لڑکے) کے نئے کپڑے نہیں دیکھے۔

دوسرے نے کہا "کیا میں جا کر لاؤں اماں"

"آپ دیکھیں گی؟ چھوٹے نے کہا مجھے بھی نئے کپڑے بنوائیے ورنہ میں نماز کیسے پڑھوں گا"؟

ماں نے جواب دیا ہاں بیٹے مجھے خود خیال ہے، اپنے ابا (امیر المومنین رح) کو آجانے دو، ان سے کہہ کر تمہارے لیے نئے کپڑے بنوا دوں گی، یہ سُن کر سب لڑکے بول اٹھے "اماں ابا کو ہم بلا لائیں"؟ اتنے میں امیر المومنین رح خود ہی تشریف لے آئے اور بیوی نے ذرا دبی آواز سے عرض کیا "عید آرہی ہے) عید کے دن چھوٹے بڑے سبھی نئے کپڑے پہنیں گے لیکن آپ کے بچوں کے پاس کوئی نیا جوڑا نہیں ہے۔ بچے نئے کپڑوں کے لیے اصرار کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ پرانے کپڑوں میں عید کی نماز پڑھنے نہیں جائیں گے۔"

جواب میں امیر المومنین رح نے کہا:

"فاطمہ! تم جانتی ہو کہ مجھے اپنے ان دل کے ٹکڑوں سے زیادہ دنیا کی کوئی شے محبوب نہیں ہے لیکن میرے پاس جو کچھ ہے اس سے تم بخوبی واقف ہو اور میرے اوپر جو ذمہ داریاں ہیں وہ بھی تمہارے علم میں ہیں، ابھی تم نے کہا ہے کہ عید میں لوگوں کے یہاں سب چھوٹے

بڑوں کے نئے کپڑے بن رہے ہیں، جس سے لوگوں کی خوش حالی و فارغ البالی کا اندازہ ہوتا ہے یہ اسی وقت برقرار رہ سکتی ہے جب کہ میں خود اپنی مثال پیش کر کے حکومت کے افسران کو ایک حد کے اندر رکھوں اور خود کو فنا کر کے دوسروں کی بقا کا سامان مہیا کروں اگر میں اپنی ذات اور اہل وعیال کے لیے ذرّہ برابر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ (نمونہ) سے ہٹوں گا تو حکومت کے افسران حد سے تجاوز کر جائیں گے اور پھر جو خوش حالی و فارغ البالی آج چاروں طرف نظر آرہی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔"

یہ سُن کر فاطمہ رح نے کہا بات تو صحیح ہے لیکن معصوم بچّے تو اس بات کو نہیں سمجھتے ہیں۔ جو بھی ہو ایک ایک نیا جوڑا تو بنوا ہی دیجیے خواہ کم قیمت کا ہو۔

امیر المومنین نے فرمایا:

"گھر کی جو صورت حال ہے وہ تمھارے سامنے ہے کیا اس میں اتنی گنجایش ہے کہ بچوں کے لیے (کم قیمت کا ہی سہی) نئے جوڑے بن سکیں گے"؟

فاطمہ رح بولیں گنجایش تو بے شک نہیں ہے لیکن ایک صورت سمجھ میں آرہی ہے وہ یہ کہ آپ ایک ماہ کا پیشگی وظیفہ سرکاری خزانہ سے لے لیں اس سے نئے جوڑے بھی بن جائیں گے اور عید کے دوسرے اخراجات بھی پورے ہو جائیں گے۔

امیر المومنین نے فرمایا:

"اچھا تو میں بیت المال (سرکاری خزانہ) کے خزانچی کو خط

لکھتا ہوں کہ وہ ایک ماہ کا پیشگی وظیفہ بھیج دے، اس کے بعد امیرالمومنین نے خزانچی کو خط لکھا، جس میں ایک ماہ کا پیشگی وظیفہ طلب کیا تھا، خزانچی نے خط کا یہ جواب دیا:

"تعمیلِ حکم سے انکار نہیں، لیکن کیا امیرالمومنین کے پاس اس بات کی ضمانت ہے کہ اس ماہ کے آخر تک وہ زندہ رہیں گے اور پورے ایک ماہ کے وظیفے کے مستحق ہوں گے اگر اس کی ضمانت نہیں ہے تو پھر کس حق کی بنا پر پیشگی وظیفہ بیت المال سے دیا جا سکتا ہے"۔

امیرالمومنین رحؒ نے یہ جواب پڑھ کر فرمایا:

"بارک اللہ (اللہ برکت کرے) فاطمہ خزانچی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے اس نے مجھے ایک زبردست غلطی سے بچا لیا ہے ورنہ میں کہیں کا نہ رہتا"۔

اس کے بعد فاطمہ رحؒ نے جو خلیفہ کی بیوی، خلیفہ کی بہن اور خلیفہ کی بیٹی تھیں) اپنے ہاتھ سے بچوں کے پرانے کپڑے دھوئے اور انھیں پہنا کر نماز پڑھنے کے لیے بھیجا۔

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا

لیس العید لمن شرب واکل	انما العید لمن اخلص اللّٰہ العمل
عید اس کی نہیں جس نے کھایا اور پیا	عید اس کی ہے جس نے اللہ کے لیے خالص عمل کیا
لیس العید لمن لبس الجدید	انما العید لمن خاف الوعید
عید اس کی نہیں جس نے نیا لباس پہنا	عید اس کی ہے جو اللہ کی وعید سے ڈرا

لیس العید لمن تبخر بالعود
عید اس کی نہیں جس نے خوشبو لگائی

انما العید لمن تاب و لا یعود
عید اس کی ہے جس نے توبہ کی اور اس کو نہیں توڑا

لیس العید لمن تزین بزینۃ الدنیا
عید اس کی نہیں جو دنیا کی زینت سے آراستہ ہوا

انما العید لمن تزود بزاد التقوی
عید اس کی ہے جس نے تقوے کو زادِ راہ بنایا

نبوّت کی تاجپوشی کا جشن

حضرات !۔ آج عید کا دن ہے، عید دراصل نبوّت کی تاج پوشی کا جشن مسرت اور مسلمانوں کی ملّی تقریبات میں سب سے اہم تقریب ہے شب قدر میں نبوّت کا تاج ہمارے آقا حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے سر پر رکھا گیا اور اللہ کا کلام (قرآن حکیم) آپ پر اتارا گیا، جس سے ایک عہد ختم ہو کر دوسرا عہد شروع ہوا اور ایک دور گزر کر دوسرے دور کی بنیاد پڑی یعنی نبوّت کی راہ سے جو فضیلت و برتری بنی اسرائیل (یہود و نصاریٰ) کو حاصل تھی اب اُمّتِ مسلمہ کے حصہ میں آئی، اور قیادت و سعادت کا تاج بنی اسرائیل کے سر تھا اب اُمّت مسلمہ اس کی مستحق قرار پائی۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ الخ ج، ع ۱۰

"اس نے تمہارا نام مسلم رکھا پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی اور یہ اس لیے کیا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے لیے حق کا گواہ ہو اور تم تمام انسانوں کے لیے، پس نماز قائم کرو، زکات ادا کرو، اللہ کو مضبوط پکڑو وہی تمہارا کار ساز ہے اور جس کا کار ساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا کار ساز

ہے اور کیا ہی اچھا مدد گار ہے۔

قیادت و سعادت کی یہ تبدیلی کسی بخت و اتفاق کی بنا پر نہ تھی، بلکہ قانونِ قدرت کے مطابق اہلیت و صلاحیت کی بنا پر تھی، جیسا کہ رسول اللہﷺ نے ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا۔

"فرض کرو تین مزدور ہیں ایک نے صبح سے ظہر تک کام کیا دوسرے نے ظہر سے عصر تک اور تیسرے نے عصر سے مغرب تک کام کیا، لیکن مزدوری تینوں کو برابر ملی۔"

پھر آپؐ نے فرمایا:

"پہلے مزدور سے مراد یہود، دوسرے سے نصاریٰ اور تیسرے سے مسلمان ہیں۔"

اس مثال میں وقت کے تفاوت کے باوجود مزدوری میں برابری سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ قیادت و سیادت کی نیابت میں اصل فیصلہ کن "کارکردگی کی صلاحیت" ہے، نہ کہ کسی گروہ و جماعت سے متعلق ہونا یا کسی خاص پیغمبر کا اُمتی ہونا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس "صلاحیت" کا جو معیار مقرر کیا ہے اس میں مادیت و روحانیت دونوں کے تناسب کو ملحوظ رکھا ہے، اگر یہ تناسب بگڑا، اور کسی ایک طرف زیادہ توجہ صرف کی گئی، تو فضیلت و برتری کی وہ سند نہ حاصل ہو سکے گی، جو دنیا کے لیے پیام رحمت ثابت ہو۔

مادیت و روحانیت کے "تناسب" کو بگاڑنے والی دراصل ایک بیماری ہے، جس کا نام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے "وھن" تجویز

کیا ہے، جس طرح "گھن" آہستہ آہستہ لکڑی کو بے کار بنا دیتا ہے، اسی طرح "وھن" رفتہ رفتہ زندگی کو بے کار کر دیتا ہے، چنانچہ آپؐ نے ایک موقع پر فرمایا۔

"ایک زمانہ آئے گا کہ دنیا کی دوسری قومیں تمہارے (مسلمانوں کے) اوپر ایسے ہی چڑھ دوڑیں گی، جیسے بھوکے دسترخوان کی طرف دوڑتے ہیں صحابہؓ نے پوچھا، اے اللہ کے رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کیا ہم اس وقت تھوڑے ہوں گے، آپ نے فرمایا نہیں تم اس وقت زیادہ ہو گے، لیکن تمہارے اندر "وھن" (نفسیاتی بیماری) پیدا ہو جائے گی، صحابہؓ نے پوچھا، یہ "وھن" کیا چیز ہے، آپؐ نے فرمایا۔

حُبّ الدنیا وکراھیۃ الموت۔ دنیا کی محبت اور موت سے ناگواری یعنی دنیا کی محبت سے سہل پسندی، عافیت کوشی اور تن آسانی وغیرہ جراثیم سرایت کر جائیں گے، اور موت سے ناگواری جاں بازی، ایثار و قربانی اور عزم و ہمت وغیرہ جواہر کا نشو نما روک دے گی پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان میں زندگی کی حیثیت پانی کے "بلبلے" سے زیادہ نہ رہ جائے گی۔

نبوّت نے اس "جشن مسرّت" کو منانے کا جو طریقہ مقرر کیا ہے اس کی ہر ہر ادا میں ندرت ہے، چنانچہ مذہبی طور پر یہ حکم ہے کہ پہلے ایک ماہ کے روزے رکھ کر جسمانی کثافتوں سے اپنے کو صاف کرو، قرآن پڑھ کر اور سن کر روحانی لطافتوں کو اپنے اندر بھر دو، پھر دور جدید یا عہد جدید کے اوّل دن صفائی ستھرائی، تہذیب و شائستگی کے ساتھ اپنے

گھروں سے نکلو، اور راستے میں ہر ایک کی زبان سے یہ صدا بلند ہو۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔

پھر سب ایک جگہ جمع ہو کر ساری دنیا کے سامنے یہ اعلان کردو۔

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔

"میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں، میں اسی کا حکم دیا گیا ہوں، اور میں مسلمانوں یعنی راہ حق کے سرفروشوں میں پہلا ہوں۔"

اس "جشن" میں شرکت کے لیے نکلنے سے پہلے ہر ایک کو بشرطِ استطاعت مذہبی طور پر اللہ کے حضور "نذرانہ" گزارنے کا حکم ہے جو ان لوگوں پر خرچ ہوگا، جو اس میں برابر کے نہیں شریک ہو سکتے ہیں، مذہب کی زبان میں اس کا نام "صدقۃ الفطر" ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضؓ کے زمانے میں اس نذرانہ اور برابر کی شرکت کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا چنانچہ ہمارے بزرگوں نے دوسروں کی مصیبت میں شریک ہو کر جس طرح اس تہوار کو منایا، تاریخ کی دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

عید کس کی!

چنانچہ حضرت علی رضؓ کو ان کی خلافت کے زمانے میں عید کے دن لوگ مبارکباد دینے کے لیے گئے تو دیکھا کہ "جو" کے سوکھے ٹکڑے

کھا رہے ہیں، آنے والوں نے کہا کہ حضرت! آج عید کا دن ہے، یہ سُن کر حضرت علیؓ نے آہ سرد بھری اور فرمایا کہ جب دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کو یہ ٹکڑے بھی میسّر نہیں تو ہمیں عید منانے کا کیوں کر حق حاصل ہے، پھر فرمایا، اصل عید تو ان لوگوں کی ہے جو عذابِ آخرت سے چھٹکارا پا چکے ہوں۔

حضرت وہبؒ بن منبہؒ کو عید کے دن روتے ہوئے دیکھ کر کسی نے کہا۔ ھٰذا الیوم السّرورِ والزّینۃِ" (یہ خوشی اور زینت کا دن ہے) وہبؒ نے فرمایا "بے شک یہ خوشی کا دن ہے، لیکن اس شخص کے لیے جس کے روزے مقبول ہو گئے ہوں"۔

حضرت شبلیؒ کو عید کے دن نہایت پریشان حالت میں دیکھ کر لوگوں نے وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ میں اس لیے پریشان ہوں کہ لوگ عید میں مشغول ہو کر وعید بھول گئے۔

حضرات! یہ عید ہمارے لیے انتہائی خوشی کا دن ہے، لیکن جب خوشی کے حالات نہ ہوں تو یہ دن ہمارے لیے عہد کا دن ہے آیئے ہم سب مل کر عہد کریں کہ ہم اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت کریں گے قومی دھارے کے بھنور سے ملّت کی کشتی پار لگائیں گے، مستقبل کی تعمیر کے لیے جان توڑ کوشش کریں گے، اور اپنا کھویا ہوا وقار و منصب واپس لائیں گے۔

دست از طلب ندارم تا کام من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زِ تن برآید

بقائے انفع کا اصول

حضرات! یہ دن مسلمانوں کی ملی تقریبات میں سب سے اہم تقریب، اور ان کے اجتماعی مسرت کے دنوں میں سب سے اہم دن ہے۔ اس جشن مسرت کو جس طرح منانے کا حکم ہے، اس سے ہماری ملت کی شناخت ہوتی ہے اور اس کی عظمت دلوں پر قائم ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ حکم دیا گیا کہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ کی عظمت و بڑائی کا اعتراف اور راہِ حق کے سرفروشوں (مسلمانوں) میں اپنا نام لکھانے کا اعلان کریں۔

لیکن یہ اعتراف و اعلان اس وقت قابلِ اعتبار نہیں جب تک اللہ کو کھانا نہ دیا جائے، پانی نہ دیا جائے اس کی بیمار پرسی نہ کی جائے اور دوسری ضروریاتِ زندگی پوری نہ کی جائیں۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ کیسا اللہ ہے کہ جو بیمار پڑتا ہے، اور کھانا پانی وغیرہ ضروریات زندگی کا محتاج ہوتا ہے، لیکن ایک حدیث قدسی میں اس سوال کا جواب موجود ہے قیامت کے دن بندوں سے سوال ہوگا۔

یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی — اے آدم کے بیٹے میں بیمار ہوا تو نے

قال کیف اعودک وانت رب العلمین قال اما علمت ان عبدی فلانا مرض فلم تعدہ اما علمت لو عدتہ لوجدتنی عندہ یا ابن آدم استطعمتک فلم تطعمنی قال یارب کیف اطعمک وانت ربُّ العالمین قال اما علمت انہ استطعمک عبدی فلانٌ فلم تطعمہ اما علمت انک لو اطعمتہ لوجدت ذلک عندی یا ابن آدم استسقیتک فلم تسقنی قال کیف اسقیتک وانت رب العالمین قال استسقاک عبدی فلان فلم تسقہ اما علمت انک لو سقیتہ لوجدت ذلک عندی (مسلم)

میری بیمار پرسی نہیں کی بندہ عرض کرے گا کہ میں آپ کی کیسے بیمار پرسی کرتا آپ تو رب العالمین ہیں ارشاد ہو گا کیا تجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا تو نے اس کی بیمار پرسی نہ کی اگر تو ایسا کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا بندہ عرض کرے گا میں آپ کو کیسے کھانا کھلاتا آپ تو رب العالمین ہیں ارشاد ہو گا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا کیا تجھے معلوم نہ تھا کہ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو میرے پاس اس کو پاتا اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا، بندہ عرض کرے گا کہ میں آپ کو کیسے پانی پلاتا آپ تو رب العالمین ہیں ارشاد ہو گا کہ میرے فلاں بندے نے پانی مانگا تھا تو نے اس کو پانی نہیں پلایا کیا تجھے معلوم نہ تھا کہ اگر تو اس کو پانی پلاتا تو میرے پاس اس کو پاتا۔

صدقۂ فطر کے نام سے اس دن اللہ کے حضور جو نذرانہ گزارنے کی تاکید ہے وہ اس لیے ہے کہ کوئی شخص ننگا بھوکا اور دیگر ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے کہ جس کی وجہ سے اس جشن مسرت میں ہمارے ساتھ شریک نہ ہو سکے۔ عید الفطر کا اہم پیغام یہ بھی ہے کہ امیر و غریب شاہ و گدا نہ صرف نماز کی صفوں میں مساوی ہوں بلکہ زندگی کی بنیادی ضروریات میں بھی مساوی ہوں۔ اللہ نے اس مساوات کو پیدا کرنے کے لیے وقت ضرورت یہاں تک جانے کا حکم دیا۔

یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو۔ (بقرہ ۲۷)	لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کس قدر خرچ کریں آپؐ کہہ دیجیے جو ضرورت سے فاضل ہو سب خرچ کر دو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لیس لابن آدم حق فی سوی هذہ الخصال بیت یسکنه وثوب یواری به عورته وجلف الخبز والماء (ترمذی)	تین چیزوں کے علاوہ اور کسی میں انسان کا کوئی حق نہیں (۱) رہنے کے لیے گھر (۲) تن ڈھکنے کے لیے کپڑا اور (۳) پانی و روٹی کا ٹکڑا۔

فتح قادسیہ کی خوش خبری سناتے وقت حضرت عمرؓ نے خلافت کی یہ ذمہ داری بیان کی تھی۔

"جب تک لوگوں میں اس حد تک وسعت ہے کہ ان کے مال کے ذریعہ ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں، میں تمہاری ضروریات پوری کرتا رہوں گا۔ اور جب یہ وسعت نہ ہو گی تو ہم زندگی میں تنگی کریں گے یہاں تک کہ کفاف (بقدر ضرورت) میں ہم

سب برابر ہو جائیں۔ کاش تم جان سکتے کہ مجھے تمہارا کس قدر خیال ہے۔ اس کو میں اپنے عمل کے ذریعہ ہی سمجھا سکتا ہوں، خدا کی قسم میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں غلام بناؤں بلکہ خود اللہ کا غلام ہوں اور حکمرانی کی امانت میرے سپرد ہے اگر میں اس کو امانت سمجھ کر تمہیں واپس کر دوں اور خدمت کے لیے تمہارے پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھاؤ پیو، تو اس (حکمرانی) کے ذریعہ فلاح پاؤں گا اور اگر اس کو ذاتی ملکیت سمجھوں (اور مطالبہ حقوق) کے لیے اپنے پیچھے چلنے اور گھر آنے پر مجبور کر دوں تو میرا انجام خراب ہو جائے گا (البدایہ والنہایہ)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحؒ جب خلیفہ ہوئے تو ذمہ داری محسوس کر کے رونے لگے، یہاں تک کہ ان کی داڑھی تر ہو گئی، ان کی بیوی فاطمہؒ نے رونے کا سبب پوچھا کہ "اَحدَثَ شَیءٌ" کیا کوئی نئی بات پیش آگئی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحؒ نے فرمایا۔

"میں نے پوری امت کی ذمہ داری لی ہے اس میں ہر قسم کے لوگ ہیں، بھوکے، فقیر بے سہارا، مریض بے سرو سامان، مجاہد بے بس مظلوم غریب، قیدی، بہت بوڑھے، کثیر العیال جن کے پاس مال کم ہے، اسی طرح مختلف علاقے کے رہنے والے دوسرے ضرورت مند ہیں، قیامت کے دن ان سب کے بارے میں مجھ سے باز پرس ہوگی اور ان سب کے مقدمہ کی پیروی کرنے والے اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم ہوں گے مجھے اندیشہ ہے کہ میں جرح میں ٹوٹ جاؤں گا اس لیے اپنی جان پر ترس کھا کر رو رہا ہوں۔ (تاریخ الکامل ج ۵)

حضرات! ہم یہ جشنِ مسرّت صحیح معنوں میں اس وقت منانے کے مستحق ہیں کہ جب ہم ایسی صلاحیت پیدا کریں کہ اس کے ذریعہ اپنے اور دوسروں کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہوں، کیوں کہ دنیا میں بحیثیت مجموعی جو قوم "نافع" ہو اسی کو بقا و پایداری حاصل ہوتی ہے اور جو غیر نافع ہو وہ رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے، قرآنِ حکیم نے اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے۔

انزل من السماء ماءً فسالت	اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، جس
اودیۃ بقدرھا فاحتمل السیل	سے نالے ندیاں اپنی مقدار کے مطابق بہنے
زبدًا رّابیًا ومما یوقدون	لگیں اور سیلاب کی رَو نے اوپر اوپر جھاگ
علیہ فی النار ابتغاء حلیۃ	پیدا کر دیے ایسا جھاگ اس وقت بھی پیدا
او متاعٍ زبدٌ مثلہ کذالک	ہوتا ہے جب کہ زیور اور دوسری چیزیں
یضرب اللہ الحق والباطل	بنانے کے لیے دھاتوں کو آگ میں پگھلاتے
فاما الزبد فیذھب	ہیں اللہ حق و باطل کی ایسی ہی مثال دیتا
جفاءً واما ما ینفع الناس	ہے، دیکھو جھاگ تو ناچیز اور ناکارہ ہو کر
فیمکث فی الارض	معدوم ہو جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے
(رعد ع ۲)	نفع بخش اور کار آمد ہے وہ باقی رہتی ہے

پانی، سونا، چاندی اور دوسری دھاتیں چوں کہ نفع پہنچانے والی ہیں اس لیے باقی رہتی ہیں اور اوپر کا جھاگ چوں کہ غیر نافع ہے اس لیے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ نافع بننے کے لیے مادّی و اخلاقی اور روحانی و جسمانی دونوں قسم کی صلاحیتوں سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔

بدقسمتی سے مسلم معاشرہ میں نافعیت کو چند اخلاق کی اصلاح میں

محدود کر کے مادّی طاقت دنیا والوں کے حوالے کر دی گئی جس کا نتیجہ ذلّت وپسپائی کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے، بالفرض اگر یہ اخلاق درست بھی ہو جائیں تب بھی مادّی طاقت کے بغیر ترقی وسربلندی نہیں حاصل ہو سکتی۔

یہ بات قانون عدل کے خلاف ہے کہ صرف چند مذہبی مراسم واعمال کی پابندی سے وہ سب کچھ مل جائے گا جس کو دنیا والے انتھک جدّو جہد اور محنت سے حاصل کرتے ہیں، اسی طرح یہ بات قانون فطرت کے خلاف ہے کہ جس طرح مادّی سبب کے بغیر معجزات وکرامات کا ظہور ہو گیا، اسی طرح مادّی طاقت کے بغیر قومی ترقی وسربلندی حاصل ہو جائے گی، بلاشبہ آگ کی خاصیت جلانا ہے جو شخص اس میں ہاتھ ڈالے گا وہ لازمی طور سے جل جائے گا، اگر ابراہیم علیہ السلام کے حق میں آگ گلزار بن گئی تو یہ معجزہ ہے جس کا عام قانون سے کوئی تعلق نہیں دنیا کا نظام عام قانون کے تحت چلتا ہے نہ کہ معجزہ وکرامت کے تحت۔

عام قانون یہ ہے:

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ـــ (النجم ع ۲)	انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔
نوف الیھم اعمالھم (ھود ع ۲)	دنیا میں کام کا بدلہ ہم پورا پورا دیتے ہیں۔
قل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ (التوبۃ ع ۱۳)	آپ کہہ دیجیے تم کام کرو اللہ اور اس کا رسول ﷺ تمہارا کام دیکھے گا

"نافع" بننے کا اثر صرف قومی ترقی و سربلندی کی شکل میں نہیں ظاہر ہوتا بلکہ اس کی وجہ سے گناہوں کی سزا بھی ملتوی کر دی جاتی ہے کیونکہ فوری سزا دینے سے نظام عالم میں خلل واقع ہوتا اور کائنات کی ترقی متاثر ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں۔

ان الحق لا یدع عاصیاً الا یجازیہ فی الدنیا مع رعایتہ ذالک النظام۔ (حجۃ اللہ البالغہ)	بے شک حق کسی گنہ گار کو اس دنیا میں سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا البتہ سزا میں دنیوی نظام کی رعایت ضروری ہے۔

اس کے بعد کہتے ہیں۔

ربما کان حکم النظام اوجب من حکم الاعمال فیستدرج بالفاجر ویضیق علی الصالح فی الظاہر ویصرف التضییق الی کسر بھیمتہ۔ (حجۃ اللہ البالغۃ)	بسا اوقات نظام عالم کا حکم اعمال کے حکم سے زیادہ تاکیدی ہوتا ہے اس بنا پر فاسق (گنہ گار) کو ڈھیل دی جاتی ہے اور نیکوکار پر بظاہر تنگی کی جاتی ہے یہ تنگی اس کی شہوانی قوت کے توڑنے میں کام آتی ہے۔

ترقی یافتہ قوموں کو اگر گناہوں کی سزا نہیں مل رہی ہے تو اس کی وجہ صرف ان کے نافع ہونے کی صلاحیت ہے ایسا نہیں ہے کہ اس دور میں گناہوں کے خواص بدل گئے ہیں یا گناہ نیکیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں ہماری نظر صرف ایک پہلو کو دیکھتی ہے اور قدرت مجموعی حیثیت کو دیکھتی ہے اگر ہم بھی تمام پہلوؤں کو دیکھنے لگیں تو قدرت کے کسی فیصلے میں شکوک و شبہات نہ پیدا ہوں

تکمیلِ دین کا جشنِ مسرّت

حضرات۔ آج ذی الحجہ کی دسویں تاریخ ہے مسلمانوں کی دوسری عید، پہلی عید نبوّت کی تاج پوشی کا جشنِ مسرّت تھی یہ عید تکمیل دین کا جشنِ مسرّت ہے، ابھی کل کی بات ہے، کہ نویں ذی الحجہ ۱۰ھ کو عرفات کے میدان میں تقریبًا ایک لاکھ مجمع کے سامنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دین کے مکمل ہونے کا اعلان فرمایا، اور یہ آیت پڑھ کر سُنائی۔

الیوم اکملت لکم دینکم
واتممت علیکم نعمتی
ورضیت لکم الاسلام
دینًا (المائدہ، ع ۱)

آج میں نے تمھارے لیے دین کو مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تمام کردی اور تمھارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔

یہ پہلا دن تھا کہ اسلام اپنے جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوا، اور انسانی حقوق کا وہ "چارٹر" نشر کیا گیا، جو اَب تک ساری دنیا کے لیے مشعلِ راہ ہے، اس کی چند دفعات یہ ہیں۔

۱۔ انسان ہمیشہ کے لیے توہّمات و خرافات اور غلط رسم و رواج

کی بیڑیوں سے آزاد ہے۔

۲۔ ذات پات، رنگ ونسل، قوم و وطن کے بُت کو اسلام نے پاش پاش کر دیا ہے، اب اس نسبت سے کسی کو کسی پر کوئی برتری نہیں ہے،

۳۔ ہر انسان کا جان و مال محترم ہے، دست درازی و دراندازی کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔

۴۔ اسلام نے عورت کے سر پر قدر و منزلت کا "تاج" رکھا ہے، ہر شخص پر اس کی حفاظت فرض ہے۔

۵۔ ہر مرد و عورت کی عزّت آبرو کی حرمت ایسی ہی ہے، جیسی قربانی کے دن ذی الحجہ کے مہینے اور مکّہ معظمہ کی حُرمت ہے۔

۶۔ سرمایہ داری کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے، اس کی نمایندگی کرنے والے "سود" کی تمام راہیں بند کر دی گئی ہیں۔

۷۔ اللہ کی کتاب ہمیشہ کے لیے ہے جو اس پر عمل کرے گا عقل وہوس کی غلامی سے نجات پا جائے گا۔

۸۔ دین میں اعتدال و میانہ روی کا لحاظ ضروری ہے، غلو و مبالغہ سے کام لینا بجائے خود ہلاکت و بربادی ہے۔

یہ چند دفعات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس طویل خطبہ سے نقل کی گئی ہیں جو آپؐ نے نویں اور دسویں ذی الحجہ کو دیا تھا، اور جس کے بعد آپؐ نے مجمع سے سوال کیا تھا:

الا ھل بلغت — کیوں، میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟

جواب ملا "ہاں"۔

پھر آپ نے اللہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

اللّٰھم اشھد — اے اللہ آپ گواہ رہیے۔

اس کے بعد لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

فلیبلغ الشاھد الغائب — جو لوگ اس وقت موجود ہیں ان کو سنا دیں جو موجود نہیں ہیں۔

(مشکوۃ باب حجۃ الوداع)

آج کی ہماری عید صرف تکمیلِ دین کا جشن مسرت ہی نہیں ہے بلکہ اس میں دین کی خاطر قربانی پیش کرنے کا مطالبہ بھی ہے، اسی کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کو "نمونہ" بنانے کا حکم دیا گیا ہے، قرآن حکیم میں ہے۔

قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ — حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کے ساتھ والوں کی زندگی میں تمھارے لیے عمدہ نمونہ ہے

(الممتحنہ ع ۱)

دوسری جگہ ہے:

لقد کان لکم فیہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر — تم میں جو اللہ اور آخرت پر یقین رکھتا ہے، اس کے لیے ان لوگوں میں عمدہ نمونہ ہے۔

(الاحزاب ع ۳)

جس بات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی نمونہ ہے وہ عشق و محبّت، ایثار و قربانی اور فدائیت و فنائیت وغیرہ اوصاف ہیں، پہلے حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا کہ محبّت کے مکان یعنی دل کو ایک مکین کے لیے خالی کرو، اس کے بعد میری طرف نظر اٹھا کر دیکھو، حضرت مسیح

علیہ السلام نے سچ کہا ہے۔

"ایک نوکر، دو آقاؤں کو خوش نہیں کر سکتا۔"

قرآن حکیم میں اس حقیقت کے اظہار کے لیے دوسری تعبیر اختیار کی گئی ہے، وہ یہ ہے۔

ماجعل اللہ لرجلٍ من قلبین فی جوفہ	اللہ نے کسی شخص کے اندر دو دِل نہیں رکھے۔

(الاحزاب ع ۱)

"دل" صرف ایک ہے، جو ایک ہی آستانہ پر جھک سکتا ہے خواہ اس کو قوم و وطن، حکومت وسطوت اور زن و فرزند کے آگے جھکالو، یا صرف "اللہ" کے آگے جھکاؤ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مکانِ محبت کو تمام آستانوں سے خالی کرایا گیا تھا، وہ جانتے تھے۔ کہ عشق و محبّت کی راہ آسایش کی نہیں، بلکہ آزمایش کی ہے، اس بنا پر ہر کڑی سے کڑی آزمایش کا مردانہ وار مقابلہ انھوں نے کیا، یہاں تک کہ جب آگ کے "الاؤ" میں ڈالنے کا حکم ہوا تو

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

آزمایش کا وہ مرحلہ نہایت سخت تھا، جب ایک وادی میں زن و فرزند (حضرت ہاجرہ و اسمٰعیل ؑ) کو تنہا چھوڑ کر خانۂ کعبہ کی تعمیر کے لیے جانے کا حکم ہوا، اس وقت بیوی نے آپؑ سے دریافت کیا،

یاابراھیم این تذھب	اے ابراہیم اس وادی میں آپ

تترکنا فی ھذا الوادی الذی لیس فیہ انیس ولا شیٔ اللہ امرک بھذا قال نعم۔

تنہا ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟ یہاں تو نہ کوئی انسان ہے نہ کوئی اور شے (انسیت والی) کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے، ابراہیمؑ نے جواب دیا "ہاں"۔

یہ سن کر حضرت ہاجرہ رضؓ نے کہا:

اذًا لا یضیعنا۔

پھر اللہ ہمیں ضائع نہ کرے گا

(بخاری کتاب الانبیاء ب۲)

حضرت ابراہیمؑ نہ صرف اس کڑی آزمایش میں پورے اترے بلکہ ایک مرحلہ وہ بھی آیا کہ جس میں اللہ کا حکم سمجھ کر باپ بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے تیار رہا، ابراہیمؑ نے کہا۔

یا بنی انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تری۔

اے پیارے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں اب تو ہی بتا تیرا کیا خیال ہے؟

حضرت اسماعیلؑ نے جواب دیا،

یاأبت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین۔ (الصفت ع ۳)

اے ابا جان! آپؐ کو جو حکم ہے اس کو کر گذریے، آپ مجھے انشاء اللہ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے،

پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے، مقصد بیٹے کو ذبح کرانا نہ تھا، بلکہ باپ کے مکانِ محبت (دل) کو صرف ایک مکین کے لیے خالی کرانا تھا۔

والذین آمنوا اشد حباً للّٰہ۔ (البقرہ، ع ۲۰)

جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ان کے دلوں میں اللہ کی محبت سب سے زیادہ ہوتی ہے،

یعنی حقیقی ایمان اس درجہ کی محبت و محبوبیت کا طالب ہے کہ تمام ماسوا کے بُت دل سے نکل کر دل صرف اللہ کا جلوہ گاہ بنے۔ پھر اللہ کے مقابلہ میں نہ عزیز سے عزیز تعلق کی کوئی قیمت رہے، اور نہ شان شوکت والی حکومت کی کوئی پروا رہے۔

آج کی ہماری قربانی اسی "ایمان" کے نتیجے میں ماسوا اللہ کی محبت قربان کرنے کا مضبوط عہد اور محبت و محبوبیت کی دنیا کے لیے ایک نئے دستور کا اعلان ہے۔

مکتبِ عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور
اس کو چھٹّی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

معرفت و محبّت کا موتی

حضرات! آج عیدالاضحیٰ ہے، مسلمانوں کی ملّی تقریبات میں دوسری بڑی تقریب۔ اس میں نماز کے بعد قربانی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، بُت پرست قوموں کا قربانی کے بارے میں خیال تھا کہ انسانوں کی طرح دیوتاؤں کو بھی چڑھاووں کی ضرورت ہے اور جانوروں کا خون بہانا ان کے غضب و قہر کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ اسلام نے اس خیال کی اصلاح کی اور کہا کہ اللہ تک نہ تو گوشت کا چڑھاوا پہنچ سکتا ہے اور نہ وہ خون بہانے کا شائق ہے۔ اصل شے جو اس کے دربار میں مقبول ہو سکتی ہے وہ دل کی نیکی اور طہارت ہے۔

قرآن حکیم میں ہے۔

لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ (الحج، ع ۵)	اللہ تک ان قربانیوں کا نہ گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون، اس تک جو کچھ پہنچتا ہے وہ صرف تمھارا تقوا اور دل کی نیکی ہے

یہ قلب یا دل کیا ہے کہ جس کی نیکی اور تقوا قربانی و دیگر امور خیر میں مطلوب و مقصود ہے؟ اس کو فنّی اصطلاحات سے ہٹ کر یوں سمجھیے

کہ انسان کا ایک ظاہری وجسمانی وجود ہے اور ایک اس کا باطنی ومعنوی وجود ہے۔ ظاہری وجود میں تدبیر و اصلاح کا ذریعہ عقل ہے اور باطنی وجود میں تدبیر واصلاح کا ذریعہ قلب ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جدید دنیا نے ظاہری وجود پر کافی ریسیرچ وتحقیق کی ہے، لیکن باطنی وجود پر اس کی تحقیقات بالکل ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ اس بنا پر مقام قلب تک اس کی رسائی ابھی نہیں ہو سکی، عارفین جن کی ریسیرچ و تحقیق کا اصل موضوع "باطنی" ہے، انھوں نے اس سلسلے میں ایسی ایسی دریافتیں کیں اور تجربات و مشاہدات سے ان کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ عقل ان کے تصوّر سے حیران ہے

عقل حیراں است در ادراکِ دل ہیچ مشکل نیست جز پیچاک دل

امام غزالی رح نے قلب کی یہ تعریف کی ہے:

ھی قوۃ لطیفۃ روحانیۃ وقوۃ باطنیۃ اعنی اللطیفۃ المدبرۃ لجمیع الجواھر [۲]	قلب ایک لطیف روحانی و باطنی قوّت کا نام ہے جو تمام جواہر کی تدبیر کرتا ہے۔

ابن تیمیہ رح کہتے ہیں:

اعنی حقیقۃ روحہ التی ھی محل معرفۃ اللہ دون اللحم والدم [۳]	قلب سے مراد گوشت پوست سے جدا اس کی روح کی وہ حقیقت ہے جو اللہ کی معرفت کا محل ہے۔

باطنی وجود میں اس قلب کی تدبیر و اصلاح کی چند شکلیں ہیں۔ مثلاً

۱۔ ایمان و وجدان کے ذریعے حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے۔

[۱، ۲] الغزالی۔ احیاء العلوم ج ۳ [۳] ابن تیمیہ شرح القصیدۃ الاصفہانیۃ

۲۔ زندگی کے ان چاکوں کی رفوگری کرتا ہے جن سے عقل عاجز ہو چکی ہے۔

۳۔ عقل اور نقل کے درمیان واسطہ کا کام دے کر دونوں میں تعلّقات درست رکھتا ہے۔

۴۔ انسان و کائنات کے درمیان روابط کا ایک اعلا و برتر شعور قائم کرتا ہے۔

جدید دنیا میں عقل کی فراوانی کے باوجود تدبیر و اصلاح کی مذکورہ شکلیں کمیاب ہیں جس کی بنا پر اس کی زندگی میں زبردست خلا پایا جاتا ہے اور ہزار کوشش کے باوجود یہ خلا پُر نہیں ہو رہا ہے۔

اسی قلب میں اللہ کی معرفت و محبّت کا موتی ٹکا ہوا ہے جس کی بنا پر حدیث قدسی میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا یسعنی سمائی ولا ارضی ولکن یسعنی قلب عبدی المومن۔ — میری سمائی نہ میرے آسمان میں ہو سکتی ہے اور نہ زمین میں لیکن مومن بندہ کے دل میں میری سمائی ہوتی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

لا یسعنی الا قلب مؤمن — میری سمائی بجز مومن کے دل کے اور کہیں نہیں ہو سکتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دل سے زیادہ کوئی اور شے اللہ کو محبوب نہیں ہے۔ ہیچ چیز عزیز ترا از دل بودے در معرفت خویش آنجا نہادے ؎ اگر دل سے زیادہ کوئی شے محبوب ہوتی تو اپنی معرفت وہیں رکھ دیتا۔

؎ مکتوب سی و ہشتم

کسی عارف کا شعر ہے۔

دل را اگر تو صاف کنی ہمچو آئینہ
در روئے جمالِ دوست بہ بینی چو آئینہ

اگر آئینہ کی طرح دل کو صاف کرلو، تو آئینہ ہی کی طرح اس میں دوست کا جمال دیکھو گے۔

او در دل من است و من اندر کف ویم
چوں آئینہ بدست من و من در آئینہ

دوست میرے دل میں ہے اور میں اس کے ہاتھ میں ہوں، جس طرح آئینہ میرے ہاتھ میں اور میں آئینہ میں ہوتا ہوں۔

دراصل یہی قلب نورانی توانائی کا مخزن، جوہر محبت کا مرکز، ایمان و شعور کا محل اور شرف و امتیاز کا مقام ہے۔

شیخ شرف الدین یحیٰی منیری فرماتے ہیں:

"موجودات و مصنوعات بے شمار تھے لیکن کسی مخلوق کے ساتھ وہ معاملہ نہ تھا جو اس مٹی پانی کے مجموعہ (انسان) کے ساتھ ہوا، جب اللہ کو منظور ہوا کہ اس خاکی پتلے کو وجود کا لباس پہنائے اور خلافت کے تخت پر بٹھائے تو فرشتوں نے عرض کیا "آپ زمین میں ایسی مخلوق کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں، جو اس پر فساد برپا کرے گی"۔ لطف قدیم نے جواب دیا، محبت میں مشورہ نہیں ہوتا اور عشق و تدبیر جمع نہیں ہوتے اگر ہمیں قبول نہ ہو تو تمہاری تسبیح و تہلیل کی کیا قیمت ہے؟ اور اگر ہمارے لطف و عنایت کا ساقی عفو و معافی کا پیمانہ انسانوں کے ہاتھ پر رکھ دے تو ان کو گناہوں سے کیا نقصان ہوگا؟ تم یہ تو دیکھتے ہو کہ معاملات میں وہ، ہم سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ محبت میں ہم ان سے تعلق رکھتے ہیں"۔ —— جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

واذا الحبیب اتی بذنب واحد　　جاءت محاسنہ بالف شفیع[1]
(جب محبوب سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو اس کے محاسن ہزار سفارشی کھڑے کر دیتے ہیں)

دوسرے مکتوب میں ہے:

"آب و خاک (انسان) کو کمتر نہ سمجھو، جو کچھ کمالات ہیں وہ اسی کے اندر موجود ہیں۔ جو کچھ دنیا میں آیا وہ اسی کے ساتھ آیا ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کی حیثیت نقش بر دیوار ہے، منقول ہے کہ شہباز محبت نے آشیانۂ عزت سے پرواز کی، عرش کے پاس پہنچا، عظمت دیکھ کر گزر گیا کرسی کے پاس پہنچا وسعت دیکھ کر گزر گیا، آسمان پر پہنچا رفعت دیکھ کر آگے بڑھ گیا، خاک (انسان) کے پاس پہنچا تو محبت دیکھ کر اتر آیا[2]

ایک اور مکتوب میں ہے۔

اللہ نے عرش پیدا کر کے مقربین کے سپرد کیا، بہشت پیدا کر کے رضوان کے حوالہ کیا، دوزخ پیدا کر کے مالک ..... کی نگرانی میں دے دیا لیکن جب مومن کا دل پیدا کیا تو فرمایا۔

القلوب بین اصبعی الرحمٰن　　دل تو رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہے[3]

حضرات! قلب کی مذکورہ کارفرمائیوں اور کارگزاریوں کے باوجود بسا اوقات انسان کی بدنیتی و بدعملی کی وجہ سے وہ زنگ آلود ہو جاتا ہے اللہ کی محبت و معرفت کا جذبہ سرد ہو کر اغراض و مقاصد کا غلبہ ہو جاتا ہے دل کی نیکی و تقوا یہ ہے کہ قربانی و ہر کار خیر میں صرف اللہ کی محبت و معرفت

---

[1] مکتوب سی و ہشتم [2] مکتوب پنجاہم [3] مکتوب چہل و سوم

ہی کا جذبہ کارفرما ہو۔ قرآن حکیم نے دل کے زنگ کو رین اور طبع سے تعبیر کیا ہے۔

کلا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون۔	ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر اعمال کی وجہ سے زنگ لگ گئے ہیں

دوسری جگہ ہے:

وتطبع علیٰ قلوبھم فھم لا یسمعون (اعراف ۱۲)	ہم ان کے دلوں پر مہر کر دیتے ہیں پھر وہ نہیں سنتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے کہا ہے:

"برے آثار مثل تاریک دھواں کے ہیں جو آئینۂ دل کی طرف چڑھتے اور تہ بہ تہ جمتے ہیں، یہاں تک کہ دل کا آئینہ تاریک ہو کر اللہ سے بالکلیہ محجوب ہو جاتا ہے اسی کو قرآن نے رین اور طبع سے تعبیر کیا ہے"۔[1]

حضرت فریدالدین مسعودؒ کا قول ہے:

دل کی شکل گلِ "نیلوفر" کی طرح سمجھنا چاہیے، جس کے دو رُخ ہیں اور دونوں رُخ شیطان (خناس) کی فرودگاہ ہیں۔ شیطان نے اس کے گرد مکڑی کی طرح جالا بن رکھا اور پردے چھوڑ رکھے ہیں اور شیطان کی کمین گاہ انھیں پردوں کے نیچے ہے۔[2]

مغربی تہذیب میں فرائڈ کی رسائی انھیں پردوں اور مکڑی جیسے جالوں تک ہوئی ہے جس کی بنا پر اس نے تحت الشعور کی ماہیت و نوعیت

---

[1] الغزالی احیاء العلوم جامع اوصاف القلب [2] گنج الاسرار فصل سوم در شرح دل

یں جنسی خواہش کا جذبہ تسلیم کیا ہے اگر اس کی رسائی اصل دل تک ہوتی تو لازمی طور سے تحت الشعور میں اللہ کی محبت کا جذبہ تسلیم کرتا قلب میں اللہ کی معرفت و محبت کا جذبہ تسلیم کرنے کے بعد نہ صرف فکرو عمل کا زاویۂ نگاہ متعین ہوتا بلکہ بہت سی نفسیاتی الجھنیں دور ہوتیں اور زندگی کی گرہیں کھلتیں۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ فرماتے ہیں۔

"فرشتوں کے کام میں جو تمھیں یکسانی نظر آتی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ حدیث محبت کے مخاطب نہیں اور انسان کے راستے میں جو نشیب و فراز نظر آتے ہیں وہ اس وجہ سے ہیں کہ ان کے ساتھ محبت کا معاملہ ہے یحبھم ویحبونہ اللہ ان سے محبت کرتا ہے وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں"۔[1]

اسی محبت کے صلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا، جس کے بدلے میں ہمیں آج یہ قربانی عطا ہوئی، اور دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو سخت سے سخت امتحانِ محبت سے دوچار ہونا پڑا، جس کے بعد اللہ کی نظر میں ان کا دل زیادہ سے زیادہ قیمتی بنا چنانچہ ایک موقع پر ہے۔

"اے بھائی ٹوٹی ہوئی چیز کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، مگر دل جتنا ٹوٹا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ایک مناجات میں عرض کیا! الٰہی آپ کو کہاں تلاش کروں فرمایا میں ان لوگوں کے پاس ہوتا ہوں جن کے دل (میری وجہ سے) ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں"۔[2]

---

[1] مکتوب چہل و ششم [2] مکتوب ششم

علامہ اقبالؒ نے کہا ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

یہ مختصر گفتگو قلب کی تدبیر و اصلاح سے متعلق ہے، اس کے علم و ادراک سے متعلق انشاءاللہ پھر کبھی گفتگو ہو گی۔

روح کی نقاب کشائی

حضرات! جی چاہتا ہے کہ آج کی اس مبارک تقریب میں روح کی نقاب کشائی کی جائے تاکہ اس سے ذکر و عبادت کا تعلق سمجھنے میں سہولت ہو۔

انسان کی زندگی میں دو قسم کی روحیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) ایک وہ جس سے اس کی حیات قائم ہے اور اطباء و ڈاکٹروں کا موضوع ہے یہ روح حیوانی کہلاتی ہے۔

(۲) دوسری وہ جس سے اس کی انسانیت برقرار ہے اور وہی ہماری آج کی گفتگو کا موضوع ہے یہ روحِ انسانی کہلاتی ہے۔ اس دوسری کے لیے قرآن حکیم میں ہے۔

فاذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سٰجدین حجر ع ۲

پھر جب میں انسان کو درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم (فرشتے) سجدہ میں گر پڑو۔

دوسری جگہ ہے۔

ثمّ سوٰہ و نفخ فیہ من

پھر اللہ نے انسان کو درست کیا اور اس

روحہ وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ سجدہ ع ۱ | میں اپنی روح پھونکی اور تمہارے لیے کان آنکھ اور دل بنائے۔

ان آیتوں سے ثابت ہے کہ روح کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا۔

الارواح جنود مجندۃ فما تعارف منھا ائتلف وما تناکر منھا اختلف۔ (مسلم کتاب البر والصلہ) | روحوں کی ایک مرتّب فوج ہے ان میں جو باہمی مناسبت رکھتی ہیں وہ باہم مل جاتی ہیں اور جن میں یہ مناسبت نہیں ہوتی وہ الگ رہتی ہیں۔

جس طرح بجلی کا اصل سرچشمہ پاور ہاؤس ہے اور اس سرچشمہ سے نکل کر سپلائی اسٹیشن Transfarmer میں بجلی جمع ہوتی اور پھر وہاں سے تار کے ذریعہ سپلائی ہوتی ہے بلاتشبیہ اسی طرح روح کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے جس سے بے شمار روحیں نکل کر کسی درمیانی مخزن (سپلائی اسٹیشن) میں جمع ہوتی ہیں اور پھر گویا "تار" کے ذریعہ ہر انسان سے تعلق جوڑا جاتا ہے پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح خون کے مختلف گروپس (A - B - AB - O) قائم کردیے گئے ہیں جس کے ذریعہ خون کی موافقت تلاش کی جاتی ہے اور اس کے بغیر کسی شخص کا خون دوسرے کے لیے کار آمد ثابت نہیں ہوتا اسی طرح "روح" کے کچھ گروپس قائم ہیں جن کے ذریعہ روحوں کی مناسبت دیکھی جاتی ہے دنیا میں انھیں لوگوں کے درمیان الفت ویگانگت پیدا ہوتی ہے جن کی روحوں میں یہ مناسبت ہوتی ہے اور جن میں نہیں ہوتی ان کے درمیان اجنبیت برقرار رہتی ہے یہ روح جس کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے اسی کی بدولت انسان

ہر قسم کی عزت و شرافت کا مستحق قرار پایا۔ خلافت و نیابت کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا اور اس بار امانت (عہدۂ تکلیف یا امانت دین) کو اٹھانے کے لائق ہوا جس کو آسمان و زمین کی کوئی مخلوق نہ اٹھا سکی۔ ایک حدیث قدسی میں ہے۔

لا اجعل من خلقته بیدی و نفخت فیہ من روحی کمن قلت لہ کن فکان۔
(مشکوۃ باب بدء الخلق)

جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اس کو ان مخلوقات کے برابر نہ کروں گا جن کے لیے میں نے لفظ "کُن" کہا اور وہ وجود میں آگئیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس "روح" کی تعبیر دریچہ یا کھڑکی سے کی ہے۔

وھی کوۃ من عالم القدس
(حجۃ اللہ البالغۃ باب حقیقۃ الروح)

وہ عالم قدس کی جانب ایک روشن دان ہے۔

اس کا تعلق چونکہ غیر مادّی دنیا سے ہے اور ہمارا سرمایۂ علم وادراک مادّی دنیا تک محدود ہے اس لیے پوری واقفیت دشوار ہے البتہ اخلاق و مذہب کی شکل میں اس روح کے مستقل مظاہر موجود ہیں جن کی بنا پر انکار کی گنجایش نہیں ہے۔ بسا اوقات اخلاق و مذہب پر عمل کرنے کا دباو اتنا شدید ہوتا ہے کہ انسان اس کے مقابلے میں طبعی تقاضوں کی پروا نہیں کرتا۔ اسی طرح زندگی کے بہت سے لمحات میں وجدان، حواس اور عقل سب کی رہنمائیاں جواب دے دیتی ہیں اور انسان کو کسی اور رہنمائی کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے یہ دباو اور احتیاج خود زندگی

میں کچھ ایسے مستقل مخفی تاروں کی نشاندہی کرتے ہیں جن کو چھیڑے بغیر زندگی کے "ساز" میں "سوز" نہیں پیدا ہوتا اور بہت سے نغمے خاموش ہو جاتے ہیں۔

یہ اللہ کی یاد اور عبادت دراصل اسی روح کو غذا اور قوت پہنچانے کے لیے اور ان تاروں کو چھیڑنے کے لیے ہے جن کے بغیر زندگی خود زندگی سے گریزاں ہوتی اور تمدن خود تمدن کا دشمن بنتا ہے۔

اللہ کی یاد اور عبادت کی بہت سی شکلیں مقرر ہیں جن کے ذریعہ روح اپنے سرچشمہ سے ربط قائم کر کے سکون حاصل کرتی اور اپنی ضرورت کی تکمیل کرتی ہے لیکن چند شکلیں ایسی ہیں جن کی حیثیت اجزائے عبادت میں وہی ہے جو اعضائے جسم میں قلب و دماغ کی ہے! اس بنا پر ان کو خاص اہمیت دی گئی اور ان پر ہماری ملی تقریبات کی بنیاد رکھی گئی وہ نماز، زکات، روزہ اور حج ہیں۔

(۱) نماز کو روح کے سرچشمہ (اللہ) سے ربط و اتصال پیدا کرنے میں خاص دخل ہے کیونکہ اس کے ذریعہ قیام و قعود اور رکوع و سجود وغیرہ مختلف شکلوں میں انسان اللہ کے حضور میں اپنی عبدیت و بندگی کا مظاہرہ کرتا اور قرأت قرآن اور دعا و تسبیحات وغیرہ میں اللہ سے ہمکلامی و سرگوشی کا شرف حاصل کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے

اقم الصلوٰۃ لذکری (طٰہٰ ع ۱) — میری یاد کے لیے نماز قائم کرو

واسجد واقترب (العلق) — سجدہ کرو اور قرب خاص حاصل کرو

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (بخاری ومسلم ومشکوٰۃ کتاب الایمان)

تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم نہیں دیکھتے وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

ان احدکم اذا قام فی الصلوٰۃ فانما یناجی ربہ (ایضاً)

بے شک تم میں جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں۔

"نماز کی اصل تین چیزیں ہیں (۱) اللہ کی عظمت وجلال کے مشاہدہ کے وقت دل میں خضوع ہو (۲) زبان سے زیادہ سے زیادہ فصیح عبارت میں اس کی عظمت وجلال کو بیان کرے اور (۳) اعضا وجوارح قلب کے خضوع میں اس کی موافقت کریں۔" (حجۃ اللہ البالغہ باب اسرار الصلوٰۃ)

(۲) زکات کو ان "رذائل" کے دور کرنے میں خاص دخل ہے جو روح کے سرچشمہ سے ربط واتصال پیدا کرنے میں رکاوٹ ڈالتے ہیں مثلاً اس کے ذریعہ مال ودولت کی حرص، دنیا سے محبت، خودغرضی وحق تلفی وغیرہ رذائل سے نفس پاک ہوجاتا ہے اور ان کے مقابل ایثار وقربانی، ہمدردی وغم خواری وغیرہ کے جذبات کی پرورش ہوتی ہے۔ گویا نماز وزکات زندگی میں روشنی پیدا کرنے کے لیے مثبت ومنفی دو تار ہیں ایک اللہ سے ربط واتصال پیدا کرتا اور دوسرا اس کے ٹوٹنے سے محفوظ رکھتا ہے اسی بنا پر قرآن حکیم نے دونوں کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے

ان الذین آمنوا وعملوا الصلحت واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ لھم

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیے نماز قائم کی اور زکات دی ان کے

جرھم عند ربھم۔ (بقرہ ع ۳۸) لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔
فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ و اگر یہ لوگ توبہ کرلیں، نماز قائم کرنے
واٰتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین۔ اور زکات دینے لگیں تو وہ تمھارے
(توبہ ع ۱۳) دینی بھائی ہیں۔

زکات کے ذریعہ ایثار و قربانی کے جذبات کی پرورش ہوتی ہے جس کے بغیر کمال نیکی حاصل کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا

لن تنالوا البر حتی تنفقوا کمالِ نیکی ہرگز حاصل نہیں کرسکتے جب
مما تحبون۔ (آل عمران ع ۱۰) تک کہ اپنی محبوب چیزیں خرچ نہ کرو

زکات کے ذریعہ دنیا کی محبت نکلتی ہے جو رذائل کی جڑ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

حب الدنیا راس کل خطیئۃ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔
(مشکوٰۃ کتاب الرقاق)

شاہ ولی اللہ رح کہتے ہیں:

"زکات میں دو مصلحتیں ہیں (۱) ایک کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے کہ اس کے ذریعہ حرص و بخل وغیرہ بدترین خصلتوں سے نفس کی صفائی ہوتی ہے اور (۲) دوسری مصلحت کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے کہ اس کے ذریعہ اجتماعی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور دین کی نصرت ہوتی ہے"۔ (حجۃ اللہ البالغہ من ابواب الزکوٰۃ)

(۳) روزہ کو ان خصوصیات کے پیدا کرنے میں خاص دخل ہے۔ ذریعہ انسان مادّی خواہشات پر قابو حاصل کرنا اور روح اپنے سرچشمہ (اللہ) کے ساتھ مناسبت پیدا کرتی ہے۔ جو مادّی خواہشات کی

وجہ سے کم ہوگئی تھی! انھیں خصوصیات کی وجہ سے پہلے لوگوں پر بھی روزہ فرض کیا گیا تھا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ (بقرہ ع ۲۲)

اے ایمان والو تمھارے اوپر روزے فرض کیے گئے جیساکہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تاکہ تم تقوا شعار بن جاؤ۔

روزہ میں جسمانی و مادّی کثافتوں سے دور رہنے اور روحانی لطافتوں کے حاصل کرنے کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔

أتاكم رمضان شهر مبارك فرض الله عليكم صيامه تفتح فيه أبواب السماء وتغلق فيه أبواب الجحيم وتغل فيه مردة الشياطين فيه ليلة خير من ألف شهر من حرم خيرها فقد حرم۔

(احمد، نسائی، مشکوٰۃ کتاب الصوم)

تمھارے پاس رمضان کا مبارک مہینا آیا جس کے روزے تمھارے اوپر فرض کیے گئے ہیں اس میں آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں. نیز سرکش شیاطین جکڑ دیے جاتے ہیں۔ اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے جو اس کی خیر و بھلائی سے محروم رہا وہ گویا محروم ہی رہ گیا۔

دوسری جگہ ہے۔

وهو شهر الصبر والصبر ثوابه الجنة وشهر المواساة (مشکوٰۃ کتاب الصوم)

رمضان صبر کا مہینا ہے جس کا ثواب جنّت ہے اور غم خواری کا مہینا ہے۔

امام غزالی رح نے روزہ کا مقصد یہ بیان کیا ہے:

"روزہ سے مقصود اللہ تعالیٰ کے اخلاق میں سے خلق صمدیت (بے نیازی) سے متصف ہونا اور بقدر امکان خواہشات پر قابو پا کر فرشتوں سے مشابہت پیدا کرنا ہے کیونکہ فرشتے خواہشات سے منزّہ ہوتے ہیں" (الغزالی احیاء العلوم ج ا ص۲۳۴)

علامہ ابن قیّم رح کہتے ہیں:

"روزہ قلب و جوارح کی صحت کی حفاظت کرتا ہے اور خواہشات کی پیروی سے جو خصوصیات سلب ہو جاتی ہیں ان کو واپس لاتا ہے" (ابن قیّم زاد المعاد ج ۲ ص ۱۵)

(۴) حج کو روح کے سرچشمہ سے رشتہ، محبّت راسخ کرنے اور خود سپردگی کی کیفیت پیدا کرنے میں خاص دخل ہے اس کے ذریعہ عشق و محبت کی ان یادگاروں سے تعلق قائم ہوتا ہے جن سے روح جسم کو رضائے مولیٰ میں گم کر دینے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس کا نعرہ یہ ہے۔

لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک۔

اے اللہ میں آپ کے دربار میں حاضر ہوں بار بار حاضر ہوں آپ کا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں بلاشبہ ساری تعریفیں اور ساری نعمتیں آپ ہی کے لیے ہیں ملک آپ کا ہے آپ کا کوئی شریک نہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ

جو لوگ استطاعت رکھتے ہوں ان کے

من استطاع الیہ سبیلا۔ (آل عمران ۱۰)

ذمہ اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ بیت اللہ کا حج کریں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

الحج المبرور لیس لہ جزاء الا الجنۃ (بخاری ومسلم کتاب الحج)

حج مقبول کا بدلہ سوائے جنت کے اور کچھ نہیں ہے۔

دوسری جگہ ہے:

من حج ھذا البیت فلم یرفث ولم یفسق رجع کما ولدتہ امہ (بخاری کتاب الحج)

جس شخص نے اس گھر کا حج کیا اور اس درمیان نہ شہوانی حرکت کی اور نہ فسق وفجور کیا تو وہ حج کر کے اس طرح پاک صاف ہو کر لوٹے گا جیسا کہ وہ آج ہی پیدا ہوا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"اللہ بزرگ و برتر کی ملاقات کا شوق اسباب ملاقات کا مشتاق بنا دیتا ہے کیونکہ عاشق اپنے محبوب کی طرف منسوب ہر شے کا لازمی طور سے مشتاق ہوتا ہے، بیت اللہ کی نسبت چونکہ محبوب کی طرف ہے اس لیے یہ نسبت ہی مشتاق بنانے کے لیے کافی ہے اس پر مستزاد یہ کہ اس کی زیارت میں کثیر اجر وانعام کا بھی وعدہ ہے۔ (الغزالی احیاء العلوم ج ا ص ۲۴۲)

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

بسا اوقات انسان اپنے رب کی زیارت وملاقات کا مشتاق ہوتا ہے اُس وقت کسی ایسی چیز کی ضرورت اور تلاش ہوتی ہے جس سے اس کا یہ شوق کسی درجہ میں پورا ہو یہ شوق صرف حج سے پورا ہو سکتا ہے۔ (شاہ ولی اللہ حجۃ البالغہ ج ۲ ص ۵۹)

غرض اس طرح اللہ کی یاد اور عبادات کے ذریعہ روح اپنے سرچشمہ سے ربط واتصال پیدا کرتی اور پھر اس سے وہ سب کچھ حاصل کر لیتی ہے جس کی اس کو ضرورت رہتی ہے، اگر اللہ کی یاد اور عبادت سے روح کو غذا اور قوت نہ پہنچائی گئی تو اس کا رشتہ اپنے سرچشمہ سے کمزور ہو جائے گا اور پھر سب کچھ حاصل کرنے کے باوجود روح کرب و بے چینی محسوس کرے گی جس کی تلافی کسی اور ذریعہ سے ناممکن ہے۔

"غور سے سن لو اللہ ہی کی یاد سے دل مطمئن ہوتے ہیں"۔

محبّت اور قربانی

حضرات! آج ملّت ابراہیمی کی عید ہے جس میں اللہ کی محبت کی خاطر ہر چیز کے قربان کرنے کا عہد و پیمان ہوتا اور بطور نمونہ سیدّنا ابراہیم علیہ السلام کی یاد تازہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لـه

تمھارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں عمدہ نمونہ ہے جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور تمام ان چیزوں سے برأت ظاہر کرتے ہیں جنکی تم پرستش کرتے ہو

غور سے دیکھا جائے تو اسلام کی حقیقت بس یہی دو چیزیں ہیں (۱) محبت اور (۲) قربانی عارفین نے انسانی عظمت و بلندی کا راز صرف اللہ کی محبت میں دیکھا ہے جس کے لیے ہر چیز کی قربانی لازمی ہے محبّت میں بڑے نشیب و فراز، اُتار چڑھاو اور لیل و نہار ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔

لـه الممتحنہ ۱۶

ای الناس اشد بلاءً — کن کو زیادہ آزمائش و مصیبت پیش آتی ہے۔
آپ نے فرمایا:
الانبیاء ثم — اللہ کے نبیوں کو پھر ان کو جو فضیلت و
الامثل — بزرگی میں ان سے قریب ہوتے ہیں پھر
فالامثل [1] — ان کو جو اُن سے قریب ہوتے ہیں

یہ محبت ہی تھی جس نے ابراہیم علیہ السّلام کو حکم دیا کہ بیٹے کی گردن پر چھری رکھ دو اور اسمٰعیل علیہ السّلام کو یہ حکم دیا کہ باپ سے یہ کہو:

یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ — اے باپ جس بات کا حکم ہے اس کو کر
اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ [2] — گزریے آپ مجھ کو انشاءاللہ صابر پائیں گے

یہ محبت ہی تھی جس نے یوسف علیہ السّلام کو حضرت یعقوبؑ سے جدا کیا اور چاہ کنعان میں جھانک کر بھی دیکھنے کی توفیق نہ دی لیکن پھر جب اسی محبت کی بجلی کوندی تو مصر سے ان کے پیرہن کی بو سونگھ لی۔

زمصرش بوئے پیراہن شنیدی — چرا درچاہ کنعانش نہ دیدی

آپ نے مصر سے ان کی قمیص کی خوشبو سونگھ لی۔کنعان کے کنویں میں آپ نے ان کو کیوں نہیں دیکھا۔

بگفت احوال ما برق جہان است — دمے پیدا و دیگر دم نہان است

جواب میں فرمایا، کہ ہمارا حال بجلی کی طرح ہے کہ چمکی پھر غائب ہوگئی۔

یہ محبت ہی تھی جس نے حضرت ایوب علیہ السّلام (جن سے بڑھ کر مشرق میں کوئی مالدار نہ تھا) کے گھر کے سارے اثاثے اور بیٹے بیٹیوں میں کسی کو نہ چھوڑا صرف جسم کی تندرستی باقی رہ گئی تھی، اس میں بھی تلوے

---

[1] ترمذی و مشکوٰۃ باب عیادۃ المریض و ثواب المرض [2] الصفت ع ۳

سے لے کر سر کی چاند تک پھوڑے نکل آئے لیکن کیا مجال ان کی زبان ایک لمحہ کے لیے شکوہ و شکایت سے آلودہ ہوئی ہو، صبر و شکر کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں صرف یہ درخواست کی۔

رَبِّ اِنِّی مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۔[۱]	اے میرے پروردگار میں دکھ میں پڑ گیا ہوں تجھ سے بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں

اور یہ محبت ہی تھی جس نے محسنِ انسانیت صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے یہ کلمات کہلوائے:

والذی نفسی بیدہ لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل ۔[۲]	اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں جان ہے میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں۔

محبت میں ہر چیز کی قربانی کا مطالبہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَاؤُکُمْ وَاَبْنَاؤُکُمْ وَاِخْوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجہادٍ فی سبیلہ	اے پیغمبر آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ بیٹے بھائی بیویاں تمہاری برادری وکنبہ قبیلہ تمہارے مال جو تم نے جمع کیا تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو تمہارے رہنے کے پسندیدہ مکانات یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ سے اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو تم

---

[۱] الانبیاء ع ۶ [۲] بخاری و مسلم، مشکوٰۃ کتاب الجہاد

فتربصوا حتی یاتی اللّٰہ بامرہ [1]	انتظار کرو یہاں تک کہ جو کچھ اللہ کو کرنا ہے وہ تمہارے سامنے آئے۔

زندگی میں الفت و محبت کے بڑے رشتے یہی ہیں اور اپنی جگہ سب مطلوب و ضروری ہیں لیکن اگر ایمان والی محبت اور ان میں مقابلہ ہو جائے تو پھر مومن وہ ہے جس پر ان میں سے کسی کا جادو نہ چل سکے اور کوئی محبت بھی اتباع و پیروی میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔

محبت میں قربانی کا حال مدینہ کے انصاریوں سے پوچھیے۔ تاریخ اسلام میں جنگ حنین پہلی جنگ ہے جس میں بکثرت مال غنیمت ہاتھ آیا اور انصاریوں کو اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہ دیا۔ یہ حالت دیکھ کر بعض نوجوانوں کو کچھ خیال ہوا تو رسول اللہ صلعم نے انصاریوں کو جمع کر کے فرمایا۔

الا ترضون ان یذھب الناس بالشاۃ والبعیر وتذھبون بالنبی الی رحالکم۔	کیا تمہاری خوشی کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ لوگ یہاں سے مال غنیمت کے حصے لے کر جائیں اور تم اللہ کے نبی کو اپنے ساتھ لے کر جاؤ۔

یہ سن کر انصار بے اختیار پکار اٹھے:

رضینا یا رسول اللّٰہ رضینا یا رسول اللّٰہ [2]	اے اللہ کے رسول صلعم ہم راضی ہیں اے اللہ کے رسول ہم راضی ہیں۔

قربانی کا حال بدر و احد کے شہداء سے پوچھیے جو اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے باوجود "فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ" (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوا) کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔

---

[1] التوبہ ۲۴ [2] بخاری و مسلم

سعدؓ بن ربیع سے پوچھیے جو "اُحد" کے زخمیوں میں پڑے سانس توڑ رہے تھے پوچھا گیا کوئی وصیت کرنی ہو تو کر دو۔ جواب دیا کہ رسولؐ اللہ کو میرا اسلام پہنچا دینا اور قوم سے کہہ دینا کہ ان کی راہ میں جانیں قربان کرتی رہے۔

عمارہؓ بن زیاد سے پوچھیے جو زخموں سے چور جاں کنی کی حالت میں پڑے تھے۔ اللہ کے رسولؐ ان کے سرہانے پہنچ گئے۔ فرمایا عمارہؓ کوئی آرزو ہے تو کہہ دو۔ عمارہ نے اپنا زخمی جسم گھسیٹ کر زیادہ قریب کر دیا اور اپنا سر آپ کے قدموں پر رکھ کر بزبان حال یہ کہا۔

منم وہمیں تمنّا کہ بوقت جاں سپردن　　بہ رخ تو دیدہ باشم تو درون دیدہ باشی

میری آرزو بس یہی ہے کہ جان نکلتے وقت آپؐ کے رُخِ زیبا کو دیکھتا رہوں اور آپؐ میری آنکھ میں سمائے رہیں۔

زیادؓ بن سکن سے پوچھیے کہ جیسے ہی اللہ کے رسولؐ نے ان کا سر ہاتھ میں لیا جان جاں آفریں کے سُپرد کر دی۔

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیاز مندے　　کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

نیاز مند کس ناز کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو رہا ہے، کہ جان سُپرد کرتے وقت آپ سرہانے موجود ہیں۔

اور اس "خنساء" نامی عورت سے پوچھیے جس نے جنگِ یرموک میں نظروں کے سامنے اپنے تمام لڑکے ایک ایک کر کے کٹوا دیے اور جب آخری لڑکا بھی شہید ہو چکا تو پکار اٹھی۔

الحمد للہ الذی اکرمنی بشھادتھم　　اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے ان کی شہادت سے عزّت بخشی۔

آج ہماری عید ہم سے محبت و قربانی کا مطالبہ کرتی ہے اور ہم عید کے مالک سے بصد آہ و زاری یہ التجا کرتے ہیں۔

خدارا بابِ رحمت کھول دے ہاں کھول دے ساقی
کھڑا کھٹکا رہا ہوں میں درِ میخانہ برسوں سے
صراحی دربغل ساغر بکف مستانہ وار آجا
لگائے آسرا بیٹھا ہے اک مستانہ برسوں سے
بس اب آجا بس اب آجا کرم فرما کرم فرما
صدائیں دے رہا ہے کوئی بیتابانہ برسوں سے
(خواجہ مجذوب)

خصوصیاتِ امّتِ مسلمہ

حضرات!

اُمّت مُسلمہ کے نام سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے جس قوم کی تنظیم کی تھی اس کو دنیا کی دوسری تمام قوموں پر فوقیت و برتری حاصل تھی جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔

ھو اجتباکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سمّاکم المسلمین من قبل و فی ھٰذا لیکون الرسول شھیدا علیکم و تکونوا شھداء علی الناس۔

(الحج ع ۱)

اللہ نے تمھیں برگزیدگی کے لیے چن لیا اس نے تمھارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ملت ابراہیمی تمھاری ملّت قرار پائی اس نے تمھارا نام مسلم رکھا، پچھلے وقتوں میں بھی اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسولؐ تمھارے لیے حق کا گواہ ہو اور تم تمام انسانوں کے لیے گواہ ہو۔

آیت میں اُمّت کی جن خصوصیات کا ذکر ہے انھیں کی وجہ سے اس کو تمام قوموں پر فوقیت و برتری دی گئی تھی، ان میں سے ہر خصوصیت پر مستقل اور تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے جس کا یہ موقع نہیں اس وقت

ایک ایسی خصوصیت پر کچھ عرض کرنا ہے جو انھیں کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی اور جس کی طرف بالعموم توجہ نہیں دی جاتی ہے۔

رمضان کی ۱۷ر تاریخ جمعہ کا دن ہے، بدر کا میدان کارزار گرم ہے، دشمن اس امّت کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہیں۔ اللہ کا رسول صلعم سربسجود زاروقطار رو رہا ہے اور اس کی بقا کے لیے ان الفاظ میں دعا کر رہا ہے:

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ	اے اللہ اگر مسلمانوں کی یہ مٹھی بھر
من اھل الاسلام فلا تعبد	جماعت ہلاک ہوگئی تو روئے زمین پر
فی الارض (مسلم کتاب الجھاد)	پھر (خالص) تیری عبادت نہ کی جائے گی

دعا کے الفاظ سے نہ صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس امت کے ساتھ بے پایاں محبت و شفقت ظاہر ہوتی ہے بلکہ ایک اہم خصوصیت کا ثبوت بھی ملتا ہے وہ یہ کہ اُمّت مسلمہ کی ہلاکت و بربادی سے روئے زمین پر خالص اللہ کی عبادت نہ ہو سکے گی جس پر دنیا کا وجود قائم ہے دوسری قوموں کی ہلاکت و بربادی سے دنیا کی ان چیزوں کا نقصان ہے جن میں ان کا عمل دخل زیادہ ہے اور یہ نقصان بھی اس درجہ کا ہے کہ جیسے دو شریکِ کار ہوں تو ایک کے فوت ہونے سے دوسرا اس کی تلافی کرتا رہے لیکن اُمّت مسلمہ کی ہلاکت و بربادی سے ایک ایسی عظیم شے کا نقصان ہے کہ جس پر دنیا کا وجود قائم ہے اور جس میں اس امت کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے۔ اگر یہ عظیم شے (خالص اللہ کی عبادت) نہ ہو تو پھر دنیا اپنے پاؤں پر نہ کھڑی رہ سکے گی بلکہ قیامت کے جھٹکے اس کو زیروزبر کر دیں گے، جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے کہ قیامت اس وقت آئے گی جبکہ روئے زمین پر خالص اللہ کا نام لینے

والے باقی نہ رہیں گے۔

لا تقوم الساعۃ حتیٰ لا یقال فی الارض اللہ اللہ [1]	قیامت اسی وقت قائم ہوگی جبکہ زمین میں اللہ اللہ نہ کہا جائے

دوسری روایت میں ہے۔

لا تقوم الساعۃ علیٰ احد یقول اللہ اللہ [2]	قیامت کسی ایسے شخص پر نہ قائم ہوگی جو اللہ اللہ کہتا ہو۔ حوالہ [2]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کا وجود قائم و برقرار رکھنے کے لیے اُمّت مسلمہ کا وجود ناگزیر ہے۔

من ھذا یعرف ان بقاء العالم ببرکۃ العباد الصالحین [3]	دنیا کا باقی رہنا صالح بندوں کی وجہ سے ہے۔

اُمّتِ مُسلمہ کی اس خصوصیت کا اظہار حضرت ربعیؓ بن عامر نے اس وقت بھی کیا تھا جبکہ وہ یزدگرد شاہ ایران کے پاس سفیر بن کر گئے تھے اس نے سوال کیا کہ تم کیوں آئے ہو؟ جواب میں حضرت ربعیؓ نے فرمایا۔

اللہ ابعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ و من ضیق الدنیا الی سعتھا و من جور الادیان الی عدل الاسلام [4]	اللہ نے ہم کو اس لیے بھیجا ہے کہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر ایک اللہ کی غلامی کی طرف اور دنیا کی تنگی سے رہائی دے کر اس کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے ظلم و ستم سے نجات دے کر اسلام کے عدل و انصاف کی طرف لائیں۔

[1،2] مسلم و مشکوٰۃ باب لا تقوم الساعۃ الا علی شرار الناس۔
[3] حاشیہ مشکوٰۃ حدیث مذکور [4] ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۳ ۷

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے اُمّت مسلمہ کی جو ایمانی تربیت کی تھی اور اس کی روح کو جو غذا و قوت پہنچائی تھی اس کے نتیجہ میں یہ خصوصیت بہت سی ان صفات کے ساتھ نمایاں ہوگئی تھی جو دنیا کی دوسری قوموں میں مفقود تھیں ـــــ مثلاً :

(۱) کسی مخلوق سے مرعوب نہ ہونا

خالص اللہ کی عبادت نے اُمّت مسلمہ کا سر اس قدر اونچا کر دیا تھا کہ وہ کسی مخلوق کے سامنے جھکنے کو تیار نہ تھی، چنانچہ مسلمانوں کا وفد جب حبشہ کے نجاشی بادشاہ کے پاس پہنچا تو اس کا دربار لگا ہوا تھا، دائیں جانب عمرو رضؓ بن العاص اور بائیں جانب عمارہ رضؓ تھے، پادری بھی دائیں بائیں بیٹھے تھے عمرو رضؓ اور عمارہ رضؓ نے بادشاہ سے شکایت کی کہ یہ لوگ کسی بڑے سے بڑے کو بھی سجدہ نہیں کرتے ہیں ـــ پادریوں نے زور دے کر بادشاہ کو سجدہ کرنے کو کہا۔ لیکن وفد کے قائد حضرت جعفر رضؓ نے صاف جواب دیا۔

لا نسجد الا اللہ [1] ہم اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے

(۲) شجاعت و جانبازی

خالص اللہ کی عبادت نے اُمّت مسلمہ کے دل میں ایسی شجاعت اور راہ خدا میں جانبازی کا ایسا جذبہ بھر دیا تھا جس کی مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے

غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "اس جنّت

---

[1] ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۳

کی طرف بڑھو جس کی وسعت آسمان و زمین ہے"۔ یہ سُن کر ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا جنت کی وسعت آسمان زمین ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، کیا تم کو شک ہے؟ کہنے لگے نہیں، بلکہ میری تمنّا ہے کہ میں جنت میں پہنچ جاؤں۔

آپ نے فرمایا ہاں ہاں تم پہنچ جاؤ گے۔ وہ چند دانے کھجور کے نکال کر کھانے لگے، پھر خود ہی کہا کہ اگر ان کھجوروں کے کھا لینے کا انتظار کروں گا تو کافی وقت لگے گا پھر اُن سب کھجوروں کو پھینک کر میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی۔[۱]

(۳) ضمیر کی ملامت

خالص اللہ کی عبادت نے اُمت مسلمہ کا ضمیر اس قدر حسّاس اور بیدار بنا دیا تھا کہ برائی اور گناہ کی باتوں کا ذکر کیا بسا اوقات مباح باتوں پر بھی وہ ملامت کے لیے تیار ہو جاتا تھا جو اس کے نزدیک کسی وجہ سے نامناسب ہوتی تھیں۔

حضرت عمرؓ کی بیوی نے (غالبًا قحط کے زمانے میں) گھی خریدا تو پوچھا یہ کیسے خریدا ہے، جواب دیا کہ آپ کی تنخواہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے میں نے اپنی ذاتی رقم سے خریدا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا:

مَا اَنَا بِذَائِقِہٖ — میں ہرگز اس کو نہیں چکھوں گا

چنانچہ گھی اور چکنائی والی چیزوں کو اس وقت تک نہیں استعمال کیا جب تک دوسرے لوگ نہ استعمال کرنے لگے۔

فَمَا اَکَلَ سَمْنًا وَلَا سَمِیْنًا حَتّٰی اَکَلَ النَّاسُ[۲] — گھی اور گھی سے بنی ہوئی چیزیں آپ نے نہیں کھائیں یہاں تک کہ دوسرے لوگ کھانے لگے

---

[۱] مسلم و مشکوٰۃ کتاب الجہاد [۲] ابن جوزی تاریخ عمر الباب الثالث والثلاثون

اسی زمانے میں ایک مرتبہ اپنے کسی بچے کے ہاتھ میں تربوز دیکھا تو فرمایا۔

بَخٍ بَخٍ یَا ابْنَ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ تَاْکُلُ	تھو! تھو! (اظہارِ نفرت کے الفاظ)
اَلْفَاکِھَۃَ وَ اُمَّۃُ مُحَمَّدٍ	تم امیر المومنین کے بیٹے ہو کر پھل کھا
ھَزْلٰی ؎۱	رہے ہو اور محمد ﷺ کی امت (غذائی سامان
	کی وجہ سے) لاغر و نحیف ہو رہی ہے

بچہ روتا ہوا بھاگا، لوگوں نے کہا کہ اس نے پیسے سے نہیں خریدا بلکہ کھجور کی گٹھلیاں دے کر خریدا ہے ؎۲

(۴) اللہ و رسول ﷺ کی محبت و فدائیت

خالص اللہ کی عبادت نے اُمّت مسلمہ کے دل میں اللہ اور رسول کی ایسی محبت بھر دی تھی کہ ان کے مقابلہ میں مال کی تو کیا حیثیت ہوتی جان کی اور عزیز سے عزیز تعلقات کی کوئی قیمت نہ تھی۔

غزوۂ احد میں ایک انصاریہ عورت کے باپ بھائی اور شوہر سب شہید ہو گئے، قیام گاہ سے نکل کر پوچھنے لگی کہ اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے۔ لوگوں نے کہا۔ بحمد اللہ خیریت سے ہیں۔ اس نے کہا کہ مجھے دکھا دو۔ جب دیکھ لیا تو بولی۔

کل مصیبۃ بعدک جلل ؎۳	آپ کی سلامتی کے بعد ہر مصیبت ہیچ ہے

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہِ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

حضرت خبیب رضؓ صحابی کو جب پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا تو لوگ کہنے لگے کہ بتاؤ کیا تمھیں یہ پسند ہے کہ محمد ﷺ تمہاری جگہ ہوں اور تمھیں چھوڑ

؎۱ ابن جوزی تاریخ عمر الباب الثالث و ثلاثون ؎۲ ابن اسحٰق و ابن خلدون ج ۲ ؎۳ ۲۸۱

دیا جائے، حضرت خبیبؓ نے کہا خدا کی قسم میں اس کو بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں کانٹا چبھے اور میں چھوڑ دیا جاؤں لہ

اس میں شک نہیں کہ اُمّت مسلمہ میں یہ خصوصیت اور اس کے ساتھ مذکورہ قسم کی صفات بہت کم ہوگئی ہیں لیکن اس گئی گزری حالت میں بھی ایک امانت اس کے پاس ایسی محفوظ ہے کہ جس سے دنیا کی تمام قومیں خطرہ محسوس کرتی ہیں اور وہ ہے "دنیا چلانے کا نقشا" جو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت میں محفوظ ہے۔

اس "نقشے" سے دنیا کی قومیں تو خائف ہیں ہی خود ابلیس بھی حد درجہ خائف ہے چنانچہ ۱۹۳۶ء کی مجلس شوریٰ میں دنیا کے شیاطین نے جمع ہو کر ان خطرات کو پیش کیا جو ابلیسی نظام کے لیے تشویش کا باعث ہیں کسی نے جمہوریت کا نام لیا، کسی نے اشتراکیت کے بارے میں کہا لیکن صدر مجلس "ابلیس" نے سب کی بات ختم کر کے اس اصل خطرے سے آگاہ کیا جس کے تصوّر سے اس کے جسم پر لرزہ طاری اور راتوں کی نیند حرام ہے چنانچہ علاّمہ اقبال نے یہ پوری داستان ابلیس کی زبانی اس طرح بیان کی ہے:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمّت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

لہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۶۳

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن، مرد آزما مرد آفریں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

غرض یہ ہے امت مسلمہ اور یہ تھیں اس کی خصوصیات اور صفات جن کو ہم بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت کا شعور و احساس اور فکر و بیداری نصیب فرمائے۔ آمین۔

عہد نامے پر دستخط کی تجدید

حضرات! ہماری اس عید میں ایک نہایت اہم عہد نامہ پر دستخط کی یاد دہانی ہوتی ہے، جس پر دستخط کے بغیر کوئی شخص مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

اس عید میں جس اہم عہد نامہ پر دستخط کی تجدید و یاد دہانی ہوتی ہے وہ اصول و صداقت کے مقابلہ میں جذبات و خواہشات کی قربانی کا عہد نامہ ہے۔ انسان کے لیے سب سے بڑی آزمایش اس کے جذبات و خواہشات کی آزمایش ہے۔ وہ سمندر کی موجوں سے نہیں گھبراتا۔ پہاڑوں کی چٹانوں سے ہراساں نہیں ہوتا۔ درندوں کے مقابلہ سے مُنہ نہیں موڑتا لیکن نفس کی ایک معمولی سی خواہش اور جذبات کی ادنا سی کشش کا بھی وہ مقابلہ نہیں کرسکتا۔ آپ تعجب کریں گے کہ دنیا ہزار ترقی کے باوجود خواہشات و جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوئی تدبیر نہ سوچ سکی اور ہزار ایجادات کے باوجود عقل کو خواہش پر فتحمند بنانے کے لیے کوئی مشین نہ ایجاد کر سکی اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات کی عکاسی کے لیے اس نے جو آئینہ تیار کیا ہے اس میں کائنات کا عکس تو بڑی حد تک نظر آگیا لیکن انسان

ہی کا صحیح عکس اس میں نہ نظر آسکا۔ انسان کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ابراہیمی نظر کی ضرورت ہے جو سائنٹفک دنیا کے پاس نہیں ہے۔ ؎

براہیمی نظر پیدا ابڑی مشکل سے ہوتی ہے ہوس چھپ چھپ کے سینہ میں بنالیتی ہے تصویریں

عہد نامہ پر دستخط کی تجدید و یاددہانی کا ذکر اس آیت میں ہے:

لَنۡ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوۡمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰـكِنۡ يَّنَالُهُ التَّقۡوٰى مِنۡكُمۡ ؎۱	اللہ تک ان قربانیوں کا نہ گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون اس کے حضور میں جو کچھ پہنچ سکتا ہے وہ تمہارا تقوا (دل کی نیکی) ہے

یہ دل کی نیکی یا تقوا کب حاصل ہوتا ہے اس کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے۔

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ؎۲	جب تک اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہ کرو کامل نیکی کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکوگے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بڑھ کر صحابۂ کرامؓ کو کون محبوب ہو سکتا ہے لیکن جب اصول وصداقت کے قربان ہونے کا اندیشہ نظر آیا تو انھوں نے جذبات و خواہشات کو کس طرح قربان کیا اس کی وضاحت چند مثالوں سے ہوتی ہے۔

(۱) جسد اطہرؐ سے روح مبارک پرواز کر جانے کے بعد مسجد نبوی میں صحابۂ کرام ایک تاریخی آزمایش سے دوچار ہوئے حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی محبّت کے جوش میں کسی طرح رسول اللہ کے وصال کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے اور قسم کھا کھا کر کہہ رہے تھے

؎۱ الحج ۵۶ ؎۲ آل عمران ۱۰۶

کہ رسول اللہ کا وصال نہیں ہوا۔ ایسی حالت میں ابو بکرؓ نے ایک طرف عشق و محبت کے تقاضے میں کمی نہ آنے دی کہ حجرۂ مبارک میں داخل ہو کر رُخ زیبا سے چادر اٹھائی۔ سر نیاز جھکایا بوسہ دیا اور رو رو کر فرمایا۔

بابی انت وامی طبت حیا وميتا ؎ — میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ زندگی اور موت دونوں میں پاکیزہ رہے۔

دوسری طرف مسجد میں آئے عمرؓ کو سمجھایا صحابہ کو روکا اور اصول وصداقت کی راہ کو اس طرح واضح کیا کہ لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اسلام زندگی و توانائی سے بھرپور نظر آنے لگا چنانچہ حمد وثنا کے بعد فرمایا۔

الا من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن کان یعبد اللہ فانہ حی لایموت۔ ؎ — جو شخص محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتا تھا وہ غور سے سن لے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا ہے اور جو شخص اللہ کی بندگی کرتا تھا تو بیشک اللہ زندہ ہے اس کے لیے موت نہیں ہے۔

اور خلافت کی سب سے پہلی تقریر میں اصول و صداقت کے مقابلہ میں جذبات و خواہشات کو قربان کرنے کا انداز اس طرح سمجھایا:

لوگو! میں تمہارا امیر بنا دیا گیا ہوں، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں اگر میں صحیح کام کروں تو میری مدد کرو اور

؎ بخاری باب فضل ابی بکر ؎ بخاری باب فضل ابی بکر

اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کردو۔ سچّائی امانت ہے جھوٹ خیانت ہے تم میں کمزور میرے نزدیک قوی ہے جب تک اس کی شکایت دور نہ کردوں اور قوی میرے نزدیک کمزور ہے جب تک اس سے حق نہ لے لوں۔[1]

(۲) حضرت عمرؓ نے اُس درخت کے کاٹنے کا حکم دیا جس کے نیچے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ میں بیعت لی تھی۔

لانهم كانوا يذهبون يصلون تحتها فخاف عليهم الفتنة[2]	کیونکہ لوگ جا کر اس کے نیچے نماز پڑھتے تھے جس سے فتنہ کا اندیشہ تھا

اپنے محبوب کی طرف منسوب چیزوں سے محبت طبعی امر ہے جس کی رعایت ضروری ہے اور کبھی اس قدر عقلی بن جاتی ہے کہ ہر ہوشمند اس کے ذریعہ قوت حاصل کرتا ہے لیکن عام حالت میں یہ محبت اگر اس حد تک تجاوز کر جائے کہ اصول وصداقت اور شرعی احکام کے مراتب نہ قائم رہ سکیں یا سیاسی بازیگر اس سے کھیلنا شروع کر دیں تو یہ مستقل فتنہ بن کر ہلاکت و بربادی کا پیغام ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ کا قول ہے

انما هلك من كان قبلكم بهذا يتبعون آثار انبياءهم فاتخذوها كنائس و بيعا[3]	تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ پہلے وہ انبیاء کی نشانیوں کے پیچھے پڑے پھر انھوں نے ان کو عبادت خانے بنا لیے۔

رسول اللہ کے بعد فتنۂ ارتداد (دین سے پھر جانے کا) زمانہ ختم ہو چکا

---

[1] البدایہ والنہایہ ج۵ باب اعتراف سعد بن عبادہ ما قالہ الصدیق فی یوم السقیفۃ، [2] الاعتصام شاطبی ج۲ فصل قد یکون اصل العمل مشروعا ص۹۳ [3] ایضاً

تھا جس میں سندان عشق کی نمود ضروری تھی اور ابوبکر رضؓ یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ اگر رسّی کی زکات بھی رسول اللہ کو دیتے تھے اور مجھے نہ دیں گے تو میں جہاد کروں گا۔ اب جام شریعت کی حفاظت کا زمانہ تھا جس میں جام وسنداں باختن کا مظاہرہ تھا۔ اور عمرؓ درخت کاٹ دینے میں حق بجانب تھے کہاں معمول رسّی کی زکات نہ دینے پر جہاد کا اعلان اور کہاں ذات اقدس سے مشرّف درخت کے نیچے نماز پڑھنے پر ہلاکت و بربادی کا پیغام ؟

درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

ایک ہاتھ میں شریعت کا جام ہے اور دوسرے ہاتھ میں عشق کا سندان ہے ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ رکھنے میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جس نے اصول وصداقت کی خاطر جذبات وخواہشات کو قربان کرنا سیکھا ہو۔

(۳) حضرت عمرؓ کو کوفہ کی حکومت کے لیے ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو قوی امانت دار اور مسلمان ہو۔ ایک شخص نے عرض کیا

خدا کی قسم میں آپ کو ایک ایسا ہی آدمی بتاتا ہوں جو قوی، امانت دار اور مسلمان سب کچھ ہے اور بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔

پوچھا وہ کون ہے۔ جواب دیا عبداللہ آپ کے صاحب زادے ہیں۔ یہ سُن کر فرمایا۔

قاتلک اللہ لہ — اللہ تمھیں محروم کرے تم نے کیسی بات کہہ دی۔

لہ تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الاربعون

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

(۴) یرموک کی لڑائی میں حضرت خالد بن ولیدؓ اسلامی فوج کے سپہ سالار تھے اور ابوعبیدہؓ بن جراح ان کے ماتحت افسر تھے۔ خلیفہ ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے خالد بن ولیدؓ کو معزول کر کے ابوعبیدہؓ بن جراح کو سپہ لار مقرر کیا اور خالد کو ان کے ماتحت کر دیا، یہ فرمان عین اس وقت پہنچا جبکہ لڑائی آخری مرحلہ میں پہنچ کر فتح ہونے والی تھی! ابوعبیدہؓ فرمان خلافت کے مطابق فوراً سپہ سالاری کا جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے کر فتح کا کریڈٹ خود حاصل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اس فرمان کو چھپایا اور خالدؓ کی ماتحتی میں بدستور اپنے کو باقی رکھا یہاں تک کہ فتح کے آثار نمایاں ہو گئے۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا اور موقع پا کر فتح کا کریڈٹ خود کیوں نہ حاصل کر لیا تو جذبات و خواہشات کی قربانی دینے والے نے جواب دیا۔

ما سلطان الدنیا ارید وما للدنیا اعمل — میں دنیا کی بڑائی نہیں چاہتا اور نہ دنیا کے لیے عمل کرتا ہوں۔

ادھر یرموک کی فتح کے بعد جب یہ خبر پھیلی کہ اس عظیم جنگ کے فاتح کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا گیا تو لوگوں کے اندر سخت بے چینی پیدا ہوئی اور بعض نے خالدؓ کو ابھارا کہ آپ خلیفہ کا حکم نہ مانیں آپ کے ساتھ کافی لوگ ہیں۔ مگر خالدؓ نے اس قسم کی ہر بات ماننے سے انکار کر دیا اور برضا و رغبت ابوعبیدہؓ بن جراح کی ماتحتی میں، ایک معمولی فوجی بن کر اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف لڑتے رہے۔ اس وقت

انھوں نے جو جملہ کہا وہ تاریخ نے ان الفاظ میں محفوظ رکھا۔

انا لا اقاتل فی سبیل عمر — میں عمر کی راہ میں جنگ نہیں کرتا
ولکن فی سبیل رب عمر — بلکہ عمر کے رب کی راہ میں جنگ کرتا ہوں۔

اوپر کی چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں ہماری ملّی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے یہ سب کچھ جو آپ نے دیکھا وہ اصول و صداقت کے مقابلہ میں جذبات و خواہشات کی قربانی کا نتیجہ تھا جس کا عہد ہر مسلمان سے لیا جاتا ہے اور جس پر دستخط کی تجدید و یاد دہانی ہر سال آج کی ہماری عید میں ہوتی رہتی ہے۔ قربانی کے وقت چھری جو جانور کی گردن پر چلتی ہے وہ دراصل نفس کی گردن پر چلائی جاتی ہے جس سے جذبات و خواہشات کی قربانی مقصود ہوتی ہے۔ اسی بنا پر قرآن میں ہے۔

کہ اللہ کو نہ اس کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون پہنچتا ہے بلکہ اس کے پاس دل کی بات پہنچتی ہے۔

نفس کی گردن پر چھری چلانے کے بعد پھر دوست کے کوچہ میں پہنچنے کے لیے زیادہ فاصلہ نہیں طے کرنا پڑتا۔

یک قدم راہ است و دیگر راہ نیست — یک قدم بر نفس نہ دیگر قدم بر کوئے دوست

راستہ صرف ایک قدم کا ہے اس کو نفس پر رکھ دو پھر دوسرا قدم دوست کے کوچے میں ہوگا۔

علم و فن کی ترقی کے اس دور میں قربانی کی حقیقت لوگوں کی سمجھ

ہیں نہیں آتی اور اس پر طرح طرح سے اعتراض کرتے ہیں ان کی خدمت
میں بس اتنی گذارش ہے ؎

اے کمال سخن کے دیوانو
ماورائے سخن بھی ہے ایک بات

نبوّت و قیادت کے کارنامے

حضرات! رمضان المبارک میں نبوت کا تاج ہمارے آقا حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے سر پر رکھا گیا اور قرآن حکیم کے ذریعہ ساری دنیا میں اس کا اعلان کیا گیا جس سے ایک عہد ختم ہو کر دوسرا عہد شروع ہوا۔ اور ایک دور گزر کر دوسرے دور کی بنیاد پڑی۔ جس نبوّت کی راہ سے جو فضیلت و برتری بنی اسرائیل (یہود و نصاریٰ) کو حاصل تھی اب اُمّتِ مسلمہ کے حصہ میں آئی اور قیادت و سعادت کا جو تاج بنی اسرائیل کے سر تھا اب اُمّتِ مسلمہ اس کی مستحق قرار پائی۔

حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوّت اور امت مسلمہ کی قیادت نے مادّی و روحانی دنیا میں، جس قدر کارنامے انجام دیے ان کی تفصیل بہت طویل ہے۔ یہاں صرف ایک کارنامہ ذکر کیا جاتا ہے جس کے احسان سے دنیا قیامت تک سبکدوش نہیں ہو سکتی وہ ہے کائنات اور انسان کے بارے میں صحیح زاویۂ نگاہ کا تعیّن۔ نبوّت و قیادت سے پہلے کائنات اور اس کی چیزوں کو مقدّس سمجھا جاتا تھا زمین دیوتا تھی، سیّارے معبود تھے جنگل کا ہر بڑا درخت اور پہاڑ کا ہر سیاہ پتھر خدا تھا۔ یونان عقلی علوم کا مرکز تھا لیکن دیوتاؤں کا مسکن

تھا۔ ہندستان ریاضی علوم کا سرچشمہ تھا لیکن مورتیوں کا بندہ تھا ایسی حالت میں کس کو ہمت تھی کہ کائنات کی چیزوں کو ہاتھ لگائے اور ان کو مفید بنا کر تمدن کے لیے استعمال کر سکے۔ یہ نبوت کا کارنامہ ہے کہ اس نے توحید کی تعلیم کے ذریعے کائنات کا تقدس ختم کر کے ہر چیز کو اللہ کی مخلوق اور انسان کا خادم قرار دیا اور قیادت کا کارنامہ ہے کہ وہ اس تعلیم پر عمل کر کے ایک عظیم الشان تہذیب وجود میں لائی جو اسپین اور سسلی ہوتے ہوئے .... اٹلی کے راستے یورپ پہنچی پھر سترھویں و اٹھارویں صدی میں یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا سبب بنی چنانچہ اب عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا اولین سبب حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے پیرؤں کے وہ کارنامے تھے جو انھوں نے اسپین کی حکومت ۱۴۹۲-۷۱۱ء کے زمانے میں دکھائے۔

جدید دنیا کے سامنے یہ ایک نہایت سنجیدہ سوال ہے کہ جب قدرت کے خزینے اور فطرت کے دفینے شروع ہی سے موجود تھے اور انسان میں ضروری حد تک ذہنی صلاحیتیں بھی قدیم زمانے سے پائی جارہی تھیں تو پھر اس خزینے اور دفینے کو تمدن کے لیے استعمال کرنے میں اتنی دیر کیوں لگی؟

مشہور مورخ "آرنلڈ ٹائن بی" نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ "پہلے زمانے میں انسان چونکہ زمین کو دیوتا سمجھتا تھا اور اس کی ہر چیز اس کی نظر میں خدا کا درجہ رکھتی تھی اس بنا پر قدرت کے خزانوں اور فطرت کے دفینوں کو انسانی تمدن کے لیے استعمال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ توحید Monotheism کا عقیدہ تھا

جس نے کائنات کا تقدس ختم کیا اور انسانوں کو اس قابل بنایا کہ وہ کائناتی چیزوں کو تمدن کے لیے استعمال کر سکے۔" (مطالعۂ تاریخ حصہ دوم)

اسی طرح نبوت و قیادت سے پہلے انسان اپنے حقیقی شرف و بلندی سے محروم تھا، بادشاہوں، مذہبی پیشواؤں اور دوسرے سرداروں کے متعلق عقیدہ تھا کہ ان کو پیدائشی طور پر آسمانی حیثیت حاصل ہے جو دوسروں کو کبھی نہیں حاصل ہو سکتی۔ کوئی دیوتا کی اولاد سے تھا، کسی کا خدا سے خصوصی رشتہ قائم تھا، کسی کے نام ازل سے سرداری و بڑائی لکھ دی گئی تھی۔ غرض اس قسم کے عقائد و خیالات نے انسان کو بحیثیت انسان پیدائشی طور پر ایک دوسرے سے کمتر و فروتر قرار دے دیا تھا۔

یہ نبوت و قیادت کا کارنامہ ہے کہ اس نے غلامی کی زنجیروں سے انسان کو آزاد کیا اور تمام امتیازات کے مصنوعی بتوں کو توڑ کر انسان کو بحیثیت انسان مکرم و معزز بنا دیا۔

جدید دنیا آزادی، مساوات اور اخوت کو فرانسیسی انقلاب کا نتیجہ قرار دیتی ہے، لیکن سب سے پہلے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و امت مسلمہ کی قیادت نے باہمی تفریق اور اونچ نیچ کے مصنوعی بتوں کو توڑا اور عزت و شرافت کا ایسا معیار مقرر کیا جو سب میں مشترک اور سب کے لیے مساوی ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

(الحجرات ع ۲)

اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی (صاحب کردار) ہو۔

حسب و نسب، رنگ و نسل، قوم و وطن، شاہی و پیشوائی کے تمام امتیازات ختم کر کے عملاً مساوات و بھائی چارگی قائم کی۔

وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ (الحجرات ع ۲)	ہم نے تمھاری ذاتیں اور قبیلے محض اس لیے بنائے تاکہ ایک دوسرے کی پہچان ہو۔
لا فضل لعربی علی عجمی و لا عجمی علی عربی۔ (مشکوٰۃ)	کسی عربی کو غیر عربی پر اور غیر عربی کو عربی پر فضیلت نہیں ہے

معاشرے میں جب کمتری و برتری اور اونچ نیچ کی معمولی تفریق ہو تو اصلاح کی معمولی تدبیروں سے کام چل جاتا ہے لیکن جب یہ تفریق بیماری بن کر قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جائے تو سخت اقدامات اور عملاً پست کو بلند اور بلند کو پست کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس سہیلؓ بن عمرو، حارثؓ بن ہشام، ابو سفیانؓ بن حرب اور قریش کے دوسرے رئیس حاضر ہوئے۔ اسی وقت حضرت صہیبؓ، حضرت بلالؓ اور دوسرے آزاد شدہ غلام بھی آگئے۔ حضرت عمرؓ نے ملاقات میں ان غلاموں کو قریش کے سرداروں پر ترجیح دی اس پر ابو سفیان نے غصہ میں کہا۔

لم اری کالیوم قطُّ یاذن هٰؤلاء العبید ویترکنا علی بابه لا یلتفت	ایسا میں نے کبھی نہیں دیکھا ان غلاموں کو اجازت ملتی ہے اور ہم دروازوں پر کھڑے رہتے

الدنیا۔ ہیں ہماری طرف کوئی توجہ نہیں
ہوتی۔ (اسد الغابہ ج ۲)

سہیل رضؓ زیادہ سمجھدار تھے انھوں نے کہا یہ ٹھیک ہے لیکن ہم کو عمر رضؓ کی نہیں بلکہ اپنی شکایت کرنی چاہیے۔ اسلام نے سب کو ایک آواز سے بلایا ان میں سے جو اپنی شامت سے پیچھے رہ گئے وہ آج بھی پیچھے رہنے کے مستحق ہیں۔ (حوالہ بالا)

مشہور قاموس نگار رُوسو ۱۷۷۸-۱۲-۱۷ء نے اپنی کتاب معاہدہ عمرانی اس جملہ سے شروع کی ہے۔

"انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن میں اس کو پابہ زنجیر دیکھتا ہوں" لیکن یہ اسی جملہ کی بازگشت ہے جس پر حضرت عمر رضؓ کی قیادت نے اپنی مملکت و سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اور جس پر وہ عمل درآمد کراتے تھے۔

متیٰ تعبّد تم الناس وقد	تم نے لوگوں کو اپنا غلام کب سے
ولدتھم امھاتھم احرارًا	بنالیا حالانکہ ان کو ان کی ماؤں
	نے آزاد پیدا کیا تھا۔

کائنات و انسان کے بارے میں صحیح زاویۂ نگاہ متعیّن کرنے کے بعد نبوّت و قیادت نے دنیا کو ایک نیا موڑ دیا، اس کے مسائل و معاملات حل کرنے کے لیے نیا ڈھنگ دیا۔ پھر انسان کی محدود زندگی لامحدود قرار پائی اور کائنات کی بے رونقی اور مُردنی لالہ زار میں تبدیل ہوئی۔

یہ تو وہ کارنامہ ہے جس تک دنیا کی رسائی اتنے عرصے کے بعد ہوئی۔

اس کے علاوہ بہت سے ایسے کارنامے بھی ہیں جن تک رسائی ابھی تک نہیں ہوسکی ان میں سرفہرست انسانیت کی صحیح گرہ کشائی ہے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوّت نے فاران کی چوٹی سے اعلان کیا۔

ایہا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا۔ "اے لوگو لا الٰہ الا اللہ کہو فلاح پاجاؤ گے۔"

یہ فلاح و کامیابی اس پر منحصر ہے کہ انسانیت کا ربط و تعلق اس کے سرچشمہ سے قائم ہو، اسی کی بدولت انسان ہر قسم کی عزت و شرافت کا مستحق قرار پایا۔ خلافت و نیابت کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا، اور محبت و محبوبیت کے فلسفہ کا اداشناس بنا۔

حضرت شیخ شرف الدین یحیٰی منیری رح فرماتے ہیں:

"جب اللہ کو منظور ہوا کہ اس خاکی پتلے کو وجود کا لباس پہنائے اور خلافت کے تخت پر بٹھائے تو فرشتوں نے عرض کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں جو اس میں فساد برپا کرے گی۔ لطفِ قدیم نے جواب دیا کہ محبت میں مشورہ نہیں ہوتا اور عشق و تدبیر جمع نہیں ہوتے۔ اگر ہمیں قبول نہ ہو تو تمھارے سبحان اللہ اور لا الٰہ الا اللہ کہنے کی کیا قیمت ہے؟ اور اگر ہمارے لطف و عنایت کا ساقی عفو و معافی کا پیمانہ انسانوں کے ہاتھ پر رکھ دے تو ان کو گناہوں سے کیا نقصان ہوگا؟ تم یہ تو دیکھتے ہو کہ معاملات میں وہ ہم سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ محبت میں ہم ان سے تعلق رکھتے ہیں۔" مکتوب ۴۶۔

استاد ابو علی دقاق رح فرماتے ہیں:

"اگر آفتاب محبت کی ضیا پاشی آدم اور اولادِ آدم پر نہ ہوتی تو آدم کا معاملہ بھی دوسرے موجودات کی طرح ہوتا۔" مکتوب ۴۶۔

عارفین نے محبت و محبوبیت کے فلسفہ کو جس انداز سے پیش کیا اس سے بہت سی نفسیاتی الجھنیں دور ہوتیں زندگی کی گرہیں کھلتیں اور اللہ کے مقدس بندوں کے ابتلاو آزمایش کے واقعات کی توجیہ ہوتی ہے کہ اللہ کے سوا عزیز سے عزیز تر کی ہر محبت اللہ کے مقابلہ میں مغلوب کر دی جائے، جیسا کہ شرف الدین منیری رح فرماتے ہیں۔

"فرشتوں کے کام میں جو ہمیں یکسانیت نظر آتی ہے وہ حدیث محبّت کے مخاطب نہیں اور انسانوں کے راستے میں جو نشیب و فراز نظر آتے ہیں وہ اس وجہ سے ہیں کہ ان کے ساتھ محبت کا معاملہ ہے یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ۔ اللہ ان سے محبت کرتا ہے وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

لا الٰہ الا اللہ میں فلاح و کامیابی کی ضمانت اس لیے رکھی گئی کہ اس کے ذریعہ محب اپنے محبوب سے ربط و تعلق قائم کر کے وہ سب کچھ حاصل کر لیتا ہے جس کی اس کی روح اور جان کو ضرورت ہوتی اور جس سے تسکین و تسلی ہوتی ہے۔ دراصل انسان کی طبیعت پر قفل پڑا ہوا ہے لا الٰہ الا اللہ اس کی کنجی ہے، جس کی دریافت میں دنیا کے بڑے مصلحین اور نشاۃ ثانیہ کے قائدین ناکام ہو چکے ہیں، اس کی دریافت کا سہرا حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کے سر ہے اور آپؐ کی ہدایت کے مطابق پہلی بار کھولنے کا سہرا اُمّتِ مسلمہ کی قیادت کے سر ہے۔

دل مجبوب کے بغیر

حضرات! ہماری یہ عید ہر سال آتی ہے اور مسلم زندگی کو ایک سبق دے کر واپس جاتی ہے اس سبق کو یاد رکھنے کے لیے سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام اور ان کے ساتھیوں کا نقشِ قدم بھی چھوڑ جاتی ہے۔

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ الخ
(الممتحنہ رکوع ۱)

تمھارے لیے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں عمدہ نمونہ ہے۔

یہ سبق عزم وہمت کی آزمایش اور عمل وکردار کے امتحان میں ثابت قدمی کا ہے۔ سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی پوری زندگی امتحان وآزمایش سے گھری ہوئی ہے۔ ذاتی مفاد واغراض کی قربانی سے لے کر اپنی جان واولاد کی قربانی تک کونسا ایسا محاذ ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے لیے نہیں کھولا گیا لیکن اللہ کا مردِ جلیلؑ ہر محاذ سے کامیابی کے ساتھ یہ کہتا ہوا گزر گیا۔

کیا حُسن نے جانا ہے کیا عشق نے سمجھا ہے
ہم خاک نشینوں کے ٹھوکر میں زمانہ ہے

امتحان و آزمایش کے یہ محاذ عام حالت میں نہیں کھلے بلکہ اس وقت کھلے جب زندگی سے زندگی ٹکرائی اور زندہ رہ کر اللہ کی بات غالب کرنے کے لیے ایک نیا موڑ پیدا ہوا یہ موڑ اگرچہ سخت و دشوار گزرا اور طرح طرح کی قربانیوں کا مطالبہ کر رہا تھا جس کی بنا پر اس سے گزرنا آسان نہ تھا لیکن اس کے دوسرے سرے پر اپنا محبوب کھڑا انتظار کر رہا تھا، منزل کی نشان دہی کر رہا تھا اور زندگی کو ایک پیغام دے رہا تھا جس کی بنا پر یہ موڑ نہایت پُر کیف و پُر کشش بن گیا تھا۔

وہ پیغام اقبال کے الفاظ میں یہ تھا:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

دراصل یہی وہ پیغام حیات ہے جس کو مکہ مکرمہ کی پہاڑی سے کائنات کے محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنایا تھا اور جس کی رعنائی و دل کشی پر تہذیب و تمدن کی شمع روشن کرنے والی سلطنتیں فریفتہ ہو گئی تھیں۔

یہی وہ پیغام حیات ہے جس کو اجمیر کی پہاڑی سے ایک فقیر بے نوا (خواجہ معین الدین ؒ) نے سنایا تھا اور جس کی جاذبیت و چاشنی ہندستان کے ذرہ ذرہ نے محسوس کی تھی۔

مسلم قوم کا سرمایۂ حیات یہی پیغام ہے جب تک یہ باقی ہے

اس کو کوئی طاقت نہ دبا سکتی ہے، نہ جھکا سکتی ہے اور نہ مرعوب وخوفزدہ بنا سکتی ہے۔ اس پیغام سے مسلم قوم کو اس قدر انسیت و محبّت ہے کہ اس کی حفاظت کی خاطر وہ ہر چیز کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے اس کے سامنے حضرت خبیبؓ ہیں کہ جب ان کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا تو لوگوں نے پوچھا کہ کیا تمھیں یہ پسند ہے کہ تمھیں چھوڑ دیا جائے اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو تمھاری جگہ پھانسی پر چڑھایا جائے؟ انھوں نے کہا یہ بات تو بہت دور کی ہے اللہ رب العزت کی قسم مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ آپؐ کے پاؤں میں کانٹا چبھے اور میں چھوڑ دیا جاؤں[1] ان کے سامنے حضرت سعد بن ربیعؓ ہیں جن کے جسم پر تیر و تلوار اور نیزہ کے ستّر زخم تھے جب ان کا حال پوچھا گیا تو جواب میں کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں میرا سلام پیش کرنے کے بعد عرض کر دینا کہ جنّت کی خوشبو پا رہا ہوں اور میری قوم انصار سے کہہ دینا کہ جب تک تمھاری آنکھ کی حرکت باقی ہے اس وقت تک تم حفاظت سے دست بردار نہیں ہو سکتے ہو[2]

علامہ اقبالؒ نے اپنی ایک مناجات میں اللہ رب العزّت سے مسلمانوں کی موجودہ پستی اور ذلّت و خواری کا سبب پوچھا تو جواب ملا کہ ان کے پاس دل ہے لیکن محبوب نہیں ہے یہ سوال و جواب ان کی زبانی اس طرح ہے:

شبے پیشِ خدا بگریستم زار مسلماناں چرا زارند و خوارند

ایک رات اللہ کے حضور زار و قطار رو کر پوچھا کہ مسلمان اس قدر ذلیل و خوار کیوں ہیں۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۴ [2] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۴۳

ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم دلے دارند و محبوبے ندارند

ندا آئی کہ تمھیں معلوم نہیں کہ اس قوم کے پاس دل تو ہے محبوب نہیں ہے۔

اقبالؒ کی یہ مناجات غالباً اس وقت کی ہے جب کہ مسلم قوم کی زندگی کا سب کچھ لٹ چکا تھا وہ بیمار پڑی اور بیماری آخری ڈگری تک پہنچ گئی تھی لیکن چوں کہ اس کو عید کا سبق یاد تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے نقشِ قدم کی شوخی نہ صرف موجود تھی بلکہ نشانِ منزل کا بھی پتا دے رہی تھی، اس بنا پر وہ اب تک موجود ہے اگرچہ اس کے پاؤں میں لڑکھڑاہٹ اور قدم میں ڈگمگاہٹ اب بھی ہے اور اس کی بے دست و پائی کا تقریباً وہی حال ہے جو اقبالؒ ہی نے حضرت جبرئیلؑ و شیطان کے مکالمہ میں شیطان کی یہ گفتگو نقل کی ہے:

خضرؑ بھی بے دست و پا الیاسؑ بھی بے دست و پا
میرے طوفان یم بہ یم دجلہ بہ دجلہ جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدمؑ کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

بہر حال اب اس قوم کو زندگی کی عمارت تعمیر کرنے کی فکر ہے عمارت کا نقشا اور خاکہ بھی موجود ہے لیکن اس کی تعمیر میں کس قسم کا ساز و سامان اور کس طرح کی کارگزاری شامل ہو وہ واضح شکل میں

اس کے سامنے موجود نہیں ہے۔ اس بنا پر مثال کے طور پر چند باتوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

(۱) زندگی کی عمارت مسلم قوم کے فطری اور تاریخی مزاج کے مطابق ہونا ضروری ہے ورنہ اس کے جسم و روح پرفٹ نہ آئے گی۔

(۲) عمارت کی تعمیر بلند و بالا مقام پر کی جائے تاکہ اس کی پرواز میں کوتاہی نہ آنے پائے۔

(۳) عمارت کے لیے ساز و سامان موجودہ دنیا اور دَور سے لیے جائیں ورنہ سکونت کے قابل نہ ہو سکے گی۔

(۴) ساز و سامان کی ترتیب اور فٹنگ میں صوفیہ کی روح سرایت ہو ورنہ اس کی طرف جاذبیت و کشش نہ ہوگی۔

(۵) عمارت کے در و دیوار میں علما کی کارگزاری شامل ہو ورنہ پائیداری کی ضمانت نہ ہوگی۔

(۶) تعمیر کا کام ان کے سپرد ہو جن کی مختلف عمارتوں پر نظر ہو۔

(۷) اور نقش و نگار کا کام ان کے حوالے ہو جو رنگ و روغن میں آمیزش کی نزاکت سے واقف ہوں۔

ظاہر ہے کہ کام کتنا اہم اور ذمہ داری کتنی نازک ہے! پھر کام کسی ایک طبقے کے کرنے کا نہیں بلکہ سب کو مل کر کرنے کا ہے اگر کوئی طبقہ بھی کام سے بے خبر اور ذمّہ داری سے غافل رہا تو مستقبل کا مؤرخ لکھنے پر مجبور ہوگا کہ جب مسلم قوم عمارت کی تعمیر کے لیے سرگرداں تھی تو مہر و وفا کا یہ کارواں راستہ سے ہٹ گیا تھا

اپنی تاریخ بھول گیا تھا اور غفلت و مدہوشی میں بہکی بہکی باتیں کرنے لگا تھا۔

اور جب قیامت کے دن رحمۃ اللعالمین صلے اللہ علیہ وسلّم اپنی اُمّت کا جائزہ لیں گے اور ہر طبقے کی تفصیلی رپورٹ پیش ہوگی تو عمارت کی تعمیر میں مہر و وفا کی ہماری کون سی کارگزاری دکھائی جائے گی اور کس قسم کے کاموں کی بدولت سرخروئی و سرفرازی حاصل ہو سکے گی۔

یہ بات واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ عمارت کی تعمیر میں سرِ دست علم و ہنر کا امتحان کم ہو گا لیکن عمل و کردار کا امتحان ہر وقت ہوتا رہے گا اور ناکامی کی بنا پر نہیں بلکہ کامیابی کی بنا پر نشیمن جلتا رہے گا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوا، لیکن آج کی عید کا سبق اسی وقت یاد سمجھا جائے گا جب کہ ہر امتحان کے وقت خودداری کی آن اور دلیری کی شان میں فرق نہ آنے پائے

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

ختمِ نبوّت کے علم کا شکرانہ

حضرات! آج ہماری یہ پاکیزہ ملّی تقریب اللہ کے حضور اس بات کا شکرانہ ہے کہ اس نے روزے کی سعادت سے نوازا اور جسمانی کثافتوں پر روحانی لطافتوں کو غالب کرنے کی توفیق دی لیکن ذرا نظر وسیع کیجیے، تو یہ ملّی تقریب ایک ایسے علم کا شکرانہ بھی ہے جس نے انسان کی صلاحیتوں کی ضابطہ بندی کی اس میں خود آگاہی و خود اعتمادی کی فضا پیدا کی اور پھر انسان موجودہ ترقی یافتہ دنیا کو وجود میں لانے کے قابل بن سکا۔

یہ ختمِ نبوّت کا علم ہے چنانچہ عید سے دو ہی تین دن پہلے غار حرا کی تاریکی اور شب قدر کی روشنی میں اللہ رب العزت نے اپنے محرم راز (فداہ ابی و امی صلے اللہ علیہ وسلم) سے انسان کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ	اپنے رب کے نام سے پڑھیے
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ	جس نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے
وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ	خون سے پیدا کیا آپ پڑھیے آپ کا
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ	رب نہایت کریم ہے جس نے قلم

مَالَمْ یَعْلَمْ (العلق) کے ذریعہ علم سکھایا انسان کو وہ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا۔

یہ قرآن حکیم کی سب سے پہلی آیتیں ہیں جن میں علم کی بدولت انسان کو تمام عزت و شرافت کا مستحق ٹھہرایا گیا اور رازدارانہ طریقہ پر انسان کی خود آگاہی اور خود اعتمادی کو ظاہر کیا گیا۔

اس علم کو انسانوں تک پہنچانے والی وہ ذات اقدس (صلے اللہ علیہ وسلم) ہے جس کے اثرات زندگی و معاشرہ پر ویسے ہی چھائے ہوئے ہیں جیسے ہر طرف آسمان چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ دنیا کی ساری بہترین قدریں اور اعلا کامیابیاں انھیں کے لائے ہوئے انقلاب اور پیش کیے ہوئے نظام حیات کی مرہونِ منّت ہے۔ اسی بنا پر پچھلے دنوں امریکہ سے شائع ہونے والی کتاب 'The-100' میں امریکی مصنّف ـــــ Hatt نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تاریخ انسانی کے سو منتخب لوگوں میں نمبر اوّل پر رکھا ہے۔

آپ نے سب سے پہلے صفا پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہو کر ایک خاص انداز میں فرمایا۔

یَا مَعْشَرَ قُرَیْشٍ اَرَاَیْتُمْ لَوْ اَخْبَرْتُکُمْ اِنَّ خَیْلًا بِالْوَادِیْ تُرِیْدُ اَنْ تُغِیْرَ عَلَیْکُمْ اَکُنْتُمْ مُصَدِّقِیَّ۔

اے قریش کے لوگو تم مجھے بتاؤ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکل کر تم پر حملہ کرنے والی ہے تو تم میری تصدیق کرو گے؟

سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

نَعْلَمُ مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ إِلَّا صِدْقًا[۱] — بے شک ہم نے کبھی آپؐ سے سوائے سچ کے اور تجربہ نہیں کیا۔

جس طرح اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر پہاڑ کی دونوں سمتوں کو دیکھ رہے تھے اسی طرح آپؐ انسان کے ظاہر و باطن کو دیکھتے۔ بہت سی ان باتوں اور ان رازوں کو پا لیتے تھے جن تک رسائی دوسروں کی نہیں ہو سکتی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو کئی مرتبہ اس طرح ظاہر فرمایا۔

إِنِّي أَرَى مَا لَا تَرَوْنَ[۲] — میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔

اس علم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) وہ جس کا تعلق وحیِ الٰہی سے ہے۔

(۲) وہ جس کا تعلق عقلِ انسانی سے ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح علمِ وحی کی تفصیلات بیان کیں وہ بہت لوگوں کو معلوم ہیں لیکن جس طرح آپؐ نے عقلی علوم کی چیزوں سے استفادہ کر کے اس کی طرف آپؐ نے رہنمائی کی وہ کم لوگوں کو معلوم ہے۔ شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفسِ نفیس اپنے زمانے کے جدید ترین قوت و طاقت کے آلات استعمال فرمائے تھے جو یہ تھے۔

دبابہ یہ خاص قسم کی گاڑی تھی جو تیر سے حفاظت کے لیے موٹا چمڑہ منڈھ کر بنائی جاتی تھی اور قلعہ شکنی کے لیے استعمال کی جاتی تھی[۳]

---

[۱] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ باب الانذار و التحذیر [۲] ترمذی و ابن ماجہ ابواب الزہد
[۳] ابو القاسم عبد الرحمٰن السہیلی الروض الانف شرح سیرۃ النبویہ لابن ہشام فصل ذکر تعلیم اہل الطائف۔

ضبر لکڑی پر کھال منڈھ کر چھتری کی طرح بنائی جاتی جس کے ذریعہ پیٹھ کی تیر سے حفاظت کی جاتی تھی۔ (شرح سیرۃ النبویہ)

منجنیق یہ ایک قسم کی مشین تھی جس کے ذریعہ وزنی پتھر دشمنوں پر برسائے جاتے تھے اور قلعہ شکنی کا کام لیا جاتا تھا۔[1]

حسک یہ ایک خار دار گھاس (گوکھرو) کی شکل کا ہتھیار تھا جس کو قلعہ اور لشکر کے چاروں طرف بکھیر کر راستے کو مخدوش کیا جاتا تھا۔[2]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان آلات کو برآمد کر کے غزوہ طائف میں استعمال فرمایا تھا[3] بلکہ منجنیق سب سے پہلے خود چلائی اور حسک اپنے ہاتھ سے بکھیری۔

ابن ہشام کہتے ہیں۔

حَدَّثَنِیْ مَنْ اَثِقُ بِہٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ اَوَّلُ مَنْ رَمٰی فِی الْاِسْلَامِ بِالْمنجنیق رمٰی اَھْلَ الطَّائِفِ[4]

جس شخص پر میں اعتماد کرتا ہوں اس نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ اسلام میں سب سے پہلے طائف والوں پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے منجنیق چلائی۔

مقریزی رح کہتے ہیں۔

وَنَصَبَ رَسُوْلُ اللّٰہِ الْمَنْجَنِیْقَ عَلٰی حِصْنِ الطَّائِفِ[5]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے طائف کے قلعہ پر منجنیق نصب کی

---

[1] لسان العرب [2] القاموس المحیط [3] تقی الدین احمد بن علی المقریزی امتاع الاسماع حصن الطائف [4] ابن ہشام السیرۃ النبویہ ذکر غزوہ الطائف۔ [5] امتاع الاسماع حصن الطائف

دوسری جگہ ہے

وَ نَثَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ الْحَسَکَ حَوْلَ الْحِصْنِ (امتاع الاسماع حصن الطائف) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قلعہ کے گرد حسک بکھیری۔

جس منجنیق کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے استعمال کیا تھا اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں بعض کے نزدیک وہ باہر سے منگائی گئی تھی اور بعض کے نزدیک حضرت سلمان فارسی رضؓ نے اسے بنایا تھا طائف فتح ہونے کے بعد ۹ھ میں عروہ بن مسعود ثقفی اور غیلان بن سلمیٰ ثقفی نے اسلام قبول کیا اور "جرش" جاکر مذکورہ بالا ایجادات میں مہارت حاصل کی [1]

"جرش" دمشق کے مضافات میں ایک شہر تھا جو اس وقت کی دوسری بڑی طاقت رومن امپائر کے قبضہ میں تھا اس میں ہتھیاروں کا بڑا کارخانہ تھا۔ شرجیل بن حسنہ نے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسے فتح کیا تھا [2]

"جرش" فتح ہونے کے بعد اسلحہ سازی کا کارخانہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو انھوں نے اور زیادہ ترقی دی۔

اس علم کے بعد انسان کے فکر و عمل میں زبردست تبدیلی ہوئی اور اپنے پانو پر کھڑے ہو کر دنیا کو موجودہ دنیا بنانے میں کامیابی حاصل کر سکا۔ اس سے پہلے انسان اپنے مسائل حل کرنے کے لیے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے اور آسمانی

---

[1] ابن ہشام السیرۃ النبویہ ج ۲ ذکر غزوۃ الطائف والروض الانف فصل ذکر تعلیم اہل الطائف

[2] امتاع الاسماع نظر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بالعرج حاشیہ ص ۳۶۳

ہدایت معلوم کرنے کا محتاج تھا اس میں نہ خود آگاہی پیدا ہوئی تھی اور نہ اس کو زندگی ز معاشرہ کے مسائل حل کرنے میں اپنے اوپر اعتماد تھا، چنانچہ اس احتیاج کی وجہ سے ہر ملک و قوم اور ہر آبادی میں نبیوں و رسولوں کے بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا گیا لیکن اس علم کے بعد انسان کو اپنے مسائل حل کرنے کے لیے نہ آسمان کی طرف دیکھنے کی ضرورت رہی اور نہ ہر موقع پر نبیوں اور رسولوں کے انتظار کی حاجت پیش آئی اب وہ اپنے سے واقف ہو گیا اور مسائل حل کرنے میں اپنے اوپر اعتماد کرنے لگا۔ اس بنا پر نبوّت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ فرض کیجیے اگر یہ سلسلہ اب بھی جاری رہتا اور آسمان سے آئے دن نئی نئی ہدایتیں آتی رہتیں تو اس مداخلت سے نہ صرف انسان کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچتی بلکہ اس کی نمو پذیر صلاحیتیں ٹھٹھر کر رہ جاتیں اور ترقی کا وہ دروازہ بند ہو جاتا جو احساس خود آگاہی اور خود اعتمادی کے بعد ہی کھلتا ہے یہ ختم نبوّت کا علم انسان کی صلاحیتوں کی ضابطہ بندی کے لحاظ سے کامل و مکمل ہے اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہ ہو گا۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ

المائدہ، الانعام

آپ کے رب کی سچائی اور انصاف کی باتیں کامل ہو گئیں اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

دوسری جگہ ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ

آج میں نے تمہارے لیے

دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا۔
المائدہ ع ۱

تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تمہارے لیے اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔

خاتم النبیین حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلّم کو اس علم پر شاہد (گواہ) بنا کر بھیجا گیا۔

یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذۡنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا۔
الاحزاب ع ۶

اے نبیؐ ہم نے آپؐ کو گواہ بنا کر بھیجا بشارت دینے والا ڈرانے والا اللہ کے حکم سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کو مقام شہادت پر کھڑا کر دینا اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے، یہ شہادت فہم و ادراک سے قول و عمل سے دنیا و آخرت میں ہر جگہ مراد ہے، چنانچہ آپؐ فرمایا کرتے تھے۔

اَنَا شَھِیۡدٌ اَنۡتَ الرَّبُّ وَحۡدَکَ لَا شَرِیۡکَ لَکَ اَنَا شَھِیۡدٌ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُکَ وَ رَسُوۡلُکَ اَنَا شَھِیۡدٌ اَنَّ الۡعِبَادَ کُلُّھُمۡ اِخۡوَۃٌ [۱]

میں گواہ ہوں کہ تو رب ہے اکیلا ہے تیرا کوئی شریک نہیں ہے میں گواہ ہوں کہ محمدؐ تیرا بندہ اور رسول ہے میں گواہ ہوں کہ سب بندے بھائی بھائی ہیں۔

---

[۱] مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۶۹ عن زید بن ارقم۔

اس شہادت کو جن لوگوں نے اپنی زندگی میں رچایا اور بسایا ان کو بھی شاہد بنایا گیا جن کی حیثیت شاہد علی الشاہد کی ہے۔

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ[1]	تاکہ رسولؐ تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔
وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔ (البقرہ ع ۱۷)	اسی طرح ہم نے تم کو معتدل اُمت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔

یہ شاہد اُمتِ مسلمہ ہے جو آج اپنی اس شہادت پر نازاں و فرحاں عید منارہی ہے اس کو جس قدر فضیلت و برتری حاصل ہے وہ مقام شہادت ہی کی بنا پر ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

انتم تتمون سبعين امة انتم خيرها واكرمها على الله تعالىٰ[2]	تم ستر بڑی اُمتوں کے تمام کرنے والے ہو اللہ کے نزدیک تم ان میں سب سے بہتر اور معزز ہو۔

یہ علم جس نے امتِ مسلمہ کو مقامِ شہادت پر کھڑا کیا، بجائے خود اس کا مستحق ہے کہ ہر سال بطور شکرانہ اس کی عید منائی جائے جس کے لیے وہ روحانی لطافتیں زیادہ موزوں ہیں جن کو کثافتوں پر غالب رکھنے کے لیے مسلسل تیس روزوں کے ذریعہ مشق کرائی گئی ہو چنانچہ ایک مرتبہ امام شافعیؒ نے اپنے استاد امام وکیعؒ سے یاد داشت کی کمی اور حافظہ خراب ہو جانے کی شکایت کی تو انھوں نے

---

[1] الحج ع ۱۰ [2] ترمذی و مشکوٰۃ باب ثواب ہذہ الامۃ

گناہ چھوڑنے کی تاکید کی جس سے کثافتیں پیدا ہوتی ہیں اور دلیل یہ دی کہ علم اللہ کا خاص فضل ہے اور خاص فضل گنہگار کو نہیں دیا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ نے اس واقعہ کو ان دو شعروں میں بیان کیا ہے۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی فاوصانی الی ترک المعاصی

میں نے حضرت وکیع سے حافظہ خراب ہونے کی شکایت کی، تو انھوں نے مجھے گناہ چھوڑنے کی تاکید کی۔

لان العلم فضل من اللہ وفضل اللہ لا یعطی لعاصی

اس لیے کہ علم اللہ کا خاص فضل ہے، اور اللہ کا یہ فضل گنہگار کو نہیں دیا جاتا۔

حضرت علیؓ اس خاص فضل پر ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کیا کرتے اور والہانہ انداز میں فرمایا کرتے تھے۔

رضینا قسمۃ الجبار فینا لنا علم وللجہال مال

ہم اللہ کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ اس نے ہمیں علم دیا اور جاہلوں کو مال دیا۔

لان المال یفنی عن قریب وان العلم باق لا یزال

اس وجہ سے کہ مال جلد ہی فنا ہو جاتا ہے اور علم ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ گفتگو علم سے متعلق ہے نہ کہ معلومات سے متعلق علم اور معلومات میں وہی فرق ہے جو بارش اور پھوار میں ہوتا ہے پھوار سے زمین تو کچھ نرم ہو جاتی ہے لیکن روئیدگی کے قابل نہیں بنتی جب کہ بارش سے زمین لالہ زار اور گل و گلزار بن جاتی ہے۔

فطرت کا برآمد شدہ خزانہ

حضرات! آج ملت اسلامیہ کی دوسری عید ہے ذرا نظر وسیع کر کے دیکھا جائے تو یہ عید ایک ایسے "دین" کا شکرانہ بھی ہے جس کے ذریعہ اللہ نے اپنی نعمت پایۂ تکمیل کو پہنچائی اور جس کی بدولت انسان اپنے مسائل حل کرنے میں ہمیشہ کے لیے خود کفیل بن گیا۔

چنانچہ ابھی کل کی بات ہے کہ نویں ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کو عرفات کے میدان میں تقریباً ایک لاکھ مجمع کے سامنے خاتم النبیین (فداہ ابی وامی) صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ رب العزت نے اعلان کرایا۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔
(سورہ مائدہ رکوع ۱)

آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے اوپر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا۔

دین کی تاریخ بتاتی ہے کہ انسان کسی زمانے میں بھی اس زمانہ کی مناسبت سے اللہ کی ہدایت و رہنمائی سے جاہل و بے خبر نہ تھا بلکہ ہمیشہ اس کے سامنے ہدایتِ الٰہی کی شمع روشن ہوتی رہی جس سے بھٹکے ہوؤں کو راستہ ملتا رہا اور زندگی آگے بڑھنے کی تربیت حاصل کرتی رہی۔

اس لحاظ سے دین کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا پھر اس کے بعد زمانے کی رفتار، حالات کے تقاضے اور فطری بنیادوں کی نشو ونما کے لحاظ سے دین کے اجزا مختلف نبیوں اور رسولوں پر اترتے رہے یہاں تک کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر دین کامل ہوگیا۔

ہر کام کا ایک وقت اور ہر شے کا ایک محل ہوتا ہے۔ وقت اور محل کا لحاظ کیے بغیر نہ کوئی ہدایت مؤثر ہوتی اور نہ اس کا نظم وضبط برقرار رہتا ہے۔ جب تک دنیا شعوری اور جغرافی لحاظ سے مختلف حصوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی اپنی اپنی سرحدوں میں محفوظ تھی اس وقت تک حسب حال دین کے مختلف اجزا ہی مناسب تھے اور وحدتِ نسلِ انسانی کا الٰہی پروگرام چلانے کا وقت ابھی نہ آیا تھا۔ لیکن جب دنیا شعوری لحاظ سے آگے بڑھی اور اس بات میں زیادہ دیر نہ رہی کہ انسانی آبادی کے ٹکڑے ایک دوسرے سے ملیں اور نوع انسان کے انفرادی و اجتماعی مسائل پر غور و فکر کریں تو اب تمام بنی نوعِ انسان کے لیے ایک ساتھ الٰہی پروگرام چلانا اور دین کو کامل شکل میں اتارنا ضروری ہوگیا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (سورہ سبا ع ۳)

آپ کہہ دیجیے اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ (الاعراف ع ۲۰)

ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوشی اور ڈر سنانے والا رسولؐ بنا کر بھیجا!

"دین" جس کی تکمیل کا ذکر ہو رہا ہے، وہ کہیں باہر سے برآمد نہیں کیا گیا بلکہ ہماری فطرت کا برآمد شدہ خزانہ ہے جو علم الٰہی (لوح محفوظ) میں محفوظ تھا اور وقت آنے پر ہماری گود میں ڈال دیا گیا۔ چنانچہ اس کے خیر و شر، حلال و حرام، طیب و خبیث، جائز و ناجائز، عدل و ظلم اور حق و باطل وغیرہ کی بنیاد اگر تلاش کرنی ہو تو انسان کی فطرت میں تلاش کرنی چاہیے۔ اگر یہ بنیاد اندر کے بجائے باہر تلاش کی گئی تو لازمی طور سے وہ نہ مل سکے گی اور انسان اپنی جہالت کو چھپانے کے لیے یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ دینی باتوں کی بنیاد نہ عقلی ہے اور نہ فطری بلکہ اضافی ہے جو حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنہ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا ہی نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

دین کی تکمیل کے بعد اس کی حفاظت و تشریح کا مرحلہ پھر بھی باقی رہتا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اس سلسلے کی اب تک جس قدر انسانی کوششیں ہوتی رہیں نتیجہ کے لحاظ سے وہ بے سود ثابت ہوئیں چنانچہ انسانی گود کی وسعت کے لحاظ سے جس قدر دینی اجزاء مختلف نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ اتارے جاتے رہے

انسان نے ان کی حفاظت و تشریح میں اپنے کیا کیا کرتب دکھائے اور کس کس طرح ان میں تبدیلی کی وہ سب دین کی تاریخ میں محفوظ اور اللہ کے سامنے موجود تھا اس بنا پر اب یہ کام انسان پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ دین کی تکمیل کے ساتھ اللہ نے اس کی حفاظت و تشریح کا ذمہ خود لیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ	ہم نے ہی ذکر (قرآن) اُتارا
وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔	اور ہم ہی اس کی حفاظت
(سورہ حجر ع ۱)	کرنے والے ہیں۔
ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ	پھر ہمارے ذمہ اس کو بیان
(سورہ قیامہ ع ۱)	کرنا ہے۔

تکمیل دین کے اس شکرانہ کے ساتھ قربانی کا جوڑ بظاہر بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس دین کی نسبت سے اُمّتِ مسلمہ کی ذمہ داری دیکھی جائے تو قربانی کا ذکر نہایت برمحل اور ضروری ہوجاتا ہے پھر اس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمونہ پیش کرنا اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی قربانی کسی ایک شئے میں محدود نہیں بلکہ ذاتی مفاد و اغراض سے لے کر جان و اولاد کی قربانی تک وسیع ہے جس کی یاد دہانی کے لیے بطور علامت و نشانی ہماری قربانی رکھ دی گئی ہے۔ یہ قربانی صرف تاریخ ہی کو یاد نہیں دلاتی بلکہ زندگی کو ایک سبق دیتی ہے اور پیغام سناتی ہے یہ پیغام اقبال کی زبانی یہ ہے:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

اُمّتِ مسلمہ کے اصولوں کی نمایندگی

حضرات! آج عید کا دن ہے جو اُمّت مسلمہ کے اصولوں کی نمایندہ اور اسلام کے تصورِ حیات کی آئینہ دار ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُمّت مسلمہ کے نام سے جس نئی قوم کی تنظیم فرمائی تھی وہ نہ رنگ و نسل کی بنیاد پر تھی اور نہ زبان و وطن کی بنیاد پر۔ اس سے آپؐ کا مقصد نہ کھانے پینے والی قوموں میں ایک اور قوم کا اضافہ تھا اور نہ بھوکی ننگی آبادی میں ایک اور آبادی کو بڑھانا تھا۔ بلکہ یہ نئی تشکیل و تنظیم ایک خاص تصوّرِ حیات کے تحت ان اصولوں کو بروئے کار لانے کے لیے تھی جن میں انسانیت کی فلاح و بہبود ہمیشہ پوشیدہ رہی ہے۔

یہ اصول زندگی کے کسی ایک دائرے سے متعلق نہ تھے بلکہ پوری انسانی زندگی ان کے دائرۂ اقتدار میں تھی۔ مثلاً:

(۱) ایمان و اعتقاد سے متعلق۔

ہر قسم کی خوبیوں کے ساتھ اللہ کو متصّف سمجھنا، ان باتوں سے

اللہ کی پاکی بیان کرنا جو اس کی شان کے مناسب نہیں، اس کے ناموں میں کجروی کو حرام سمجھنا، اس کے علم و اندازہ پر ایمان رکھنا فرشتوں، رسولوں، قیامت اور مرنے کے بعد کی زندگی کو برحق سمجھنا۔

(۲) عبادت و پاکی سے متعلق۔

جسم و لباس کو گندگی و میل سے پاک و صاف رکھنا، قلب و دماغ کو ہر قسم کی آلودگیوں اور آلائشوں سے دور رکھنا، نفس و شرمگاہ کو کثافتوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھنا۔ زبان، آنکھ کان وغیرہ قوتوں کو غلط استعمال سے بچانا۔

(۳) عبادت وطاعت سے متعلق۔

عبادت وطاعت کے ذریعہ اللہ کی زیادہ سے زیادہ تعظیم کرنا چہرہ اور دل اس کے سپرد کرنا، خالص اسی کی عبادت وطاعت کو اپنے اوپر فرض سمجھنا، شعائر (وہ نشان و علامات جو اللہ کی یاد اور قرب حاصل کرنے کے لیے مقرر ہیں) کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرنا، عبادت و استعانت میں شرکت حرام سمجھنا اور اسی کو نفع و ضرر کا مالک و مختار سمجھنا۔

(۴) نیکی و بدی سے متعلق۔

اصل نیکی دل کی پاکی و عمل کی سچائی ہے جس کے لیے محض ضابطہ کی خانہ پُری کافی نہیں بلکہ اللہ سے مستقل ربط و تعلق ضروری ہے نیکی زندگی کے کسی ایک گوشہ میں محدود نہیں بلکہ اس کا تعلق زندگی کے تمام گوشوں سے ہے۔ کمال نیکی حاصل کرنے کے لیے اپنی پسندیدہ چیزوں کی قربانی لازمی ہے نیکی کے کاموں میں ایک

دوسرے کی مدد ضروری ہے۔ نیکی کے مقابل بدی ہے وہ بھی کسی ایک گوشہ میں محدود نہیں بلکہ زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

(۵) پاکیزہ وگندی چیزوں سے متعلق۔

پاکیزہ اور گندی چیزیں برابر نہیں ہیں، ایک کو دوسرے سے بدلنے کی اجازت نہیں ہے۔ گفتگو، تعلقات زندگی، روزی اور اولاد وغیرہ ہر ایک میں پاکیزگی کو اختیار کرنا اور گندگی سے دور رہنا ضروری ہے۔

یہ ہیں وہ اصول جن پر دنیا کے اعلا درجہ کے انسان (انبیاء علیہم السلام) ہمیشہ متفق رہے، انسانیت کی فلاح اس میں تسلیم کی جاتی رہی اور ہماری عید کی ہر ادا میں انھیں کی نمایندگی ہوتی ہے۔

ان اصولوں کے مطابق زندگی اور تہذیب کی عمارت تعمیر کرنے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کن کن چیزوں پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہوئی کن کن گوشوں تک رسائی حاصل کرنی پڑی اور نفسی قوتوں کے پیش نظر قول وفعل کو کس کس انداز سے ڈھالنا پڑا، ان سب کے لیے جسمانی طبیب حاذق کے کام میں غور کرنے کی ضرورت ہے، جس کی نظر جسم کی صحت، مرض کی قوت، اس کی نوعیت، مریض کی عمر، جائے رہائش اور موسم، نیز دوا وغذا کی قوت ان کی خاصیت واثر اور پرہیز وعلاج سے متعلق تمام باتوں پر ہوتی ہے۔ اور پھر ان کے لحاظ سے وہ بہت سی ان باتوں کی خبر دیتا جن کو لوگ نہیں جانتے۔ ان باریکیوں کا احاطہ کرتا جن سے وہ لاعلم ہوتے کبھی وہ محسوس امور

کو مخفی امور کے قائم مقام قرار دیتا ہے۔ مثلاً چہرے کی سُرخی اور مسوڑے سے خون جاری ہونے کو غلبۂ خون کی علامت قرار دیتا، کبھی علامت کو بجائے سبب مرض اور دوا کی مخصوص مقدار کو بجائے ازالۂ مرض قرار دے کر قاعدہ کلیّہ وضع کرتا ہے۔ مثلاً جو شخص فلاں دوا یا معجون کی اتنی مقدار نہ استعمال کرے گا وہ ہلاک ہو جائے گا، کبھی وہ مرض و مریض کی نوعیت کے پیش نظر نئی دوائیں اور نئے مرکّبات تیار کرکے ان کو خاص امراض کے لیے تیر بہدف ثابت کرتا ہے وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں کے لیے صرف علم طب کافی نہیں ہے بلکہ فنّی حذاقت و مہارت اس درجہ کی درکار ہے کہ اس کو وقت ضرورت فنّی الہام ہوتا رہے۔

انسان کی نفسی زندگی کا معاملہ "جسمانی" سے کہیں زیادہ باریک اور جذب وانجذاب کو قبول کرنے والا ہے اس بنا پر لازمی طور سے اس کے مرض و مریض دوا و غذا اور پرہیز و علاج کی نزاکتوں کو سمجھنے کے لیے فنّی حذاقت و مہارت کافی نہیں ہے بلکہ نورانی شعاؤں کی بھی ضرورت ہے جن کے ذریعہ ان مخفی اور باریک تاروں کا عکس لیا جا سکے، جن کو چھیڑے بغیر زندگی کے ساز میں سوز نہیں پیدا ہوتا اور بہت سے نغمے خاموش رہتے ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان نورانی شعاؤں سے کام لے کر عقائد و عبادات، اقدار و اخلاق، عادات واطوار، معروف و منکر، حلال و حرام اور طیبات و خبائث کی عمارت تعمیر کی جن کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے اور ان میں انسانیت کی فلاح و بہبود کو سمجھنے کے لیے انسان کی نفسی قوتوں، باریک تاروں اور ان کے زیر و بم سے واقفیت

ضروری ہے۔

ان اصولوں کے مطابق تیار شدہ عمارت میں اُمتِ مسلمہ زندگی گزارتی ہے جس کا ہر فرد ذمہ دار اور اللہ کے سامنے جواب دہ ہے جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال کے ذریعہ اس ذمہ داری و نگرانی کو سمجھایا ہے، آپؐ نے فرمایا فرض کرو ایک بحری جہاز ہے جس کے اوپر نیچے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور سب کی ضرورت کا سامان پانی وغیرہ جہاز کے بالائی حصّہ پر رکھا ہوا ہے، نچلے حصّہ کے لوگ پانی کے لیے اوپر آتے رہتے ہیں اگر اوپر والے جذبۂ اشتراک کے تحت پانی دے دیتے ہیں تو سب کا کام اطمینان سے چلتا رہتا ہے اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آتا، لیکن اگر یہ اس بنا پر پانی دینے سے انکار کرتے ہیں کہ ان کے آنے سے معمولی سی تکلیف ہوتی ہے تو وہ پانی کی فراہمی کے لیے دوسری تدبیریں کرنے پر مجبور ہوں گے، چار و ناچار انھوں نے یہ سوچا کہ چھوٹا سوراخ کر کے سمندر سے پانی حاصل کیا جائے چنانچہ وہ سوراخ کرنے لگے۔

اب اگر اوپر والے نہ تو سوراخ سے روکیں اور نہ ہی پانی کا بند وبست کریں تو ظاہر ہے کہ جہاز میں سوراخ ہونے کے بعد اس میں پانی بھر جائے گا اور وہ ڈوب جائے گا پھر نہ سوراخ کرنے والے بچیں گے اور نہ اس سے چشم پوشی و غفلت کرنے والے۔

یہ حدیث قومی و جماعتی زندگی کی نفسیات اور اس کے مطالبات سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ جماعتی زندگی کو سمندری جہاز پر سواری کے ساتھ تشبیہ دینا، اس کی ضروریات کو پانی جیسی اہم

چیز کے ذریعہ بیان کرنا، تکلیف کے باوجود تعاون واشتراک کے جذبہ کو نظر انداز نہ کرنا، اور خلاف ورزی کی صورت سے جہاز میں سوراخ ہونا (اگرچہ یہ سوراخ کسی اہم ضرورت کی بنا پر کیا گیا ہو) اور اس کے نتیجہ میں جہاز ڈوب جانا یہ ساری باتیں نہایت غور وفکر کی مستحق ہیں۔

ذمہ داری، نگرانی اور اللہ کے سامنے جواب دہی سے غفلت برتنے کے نتیجہ میں جو جرثومہ (کیڑا) پیدا ہو کر اس اُمّت کو کھوکھلا کر دیتا ہے اس کی طرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ارشاد فرمایا۔

"ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ دنیا کی دوسری قومیں امت مسلمہ پر ایسے ہی لوٹ پڑیں گی جیسے کھانے کے برتن میں تر نوالہ کے لیے بھوکوں کے ہاتھ پڑتے ہیں، صحابہؓ کرام نے سوال کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا ہم لوگ اس وقت تعداد میں تھوڑے ہوں گے؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا نہیں بلکہ تم لوگ زیادہ ہوگے لیکن "جھاگ" کی طرح بے وزن ہو جاؤ گے۔ صحابہؓ نے پوچھا ہماری یہ حالت کیوں ہو جائے گی؟ آپؐ نے فرمایا تم میں وھن پیدا ہو جائے گا، آپؐ سے سوال کیا گیا دما الوھن، وہن کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔

حُبُّ الدُّنْیَا وَکَرَاهِیَةُ الْمَوْتِ۔ — دنیا سے محبت اور موت سے کراہیت۔

ؔلہ مشکوٰۃ باب تغیر الناس

یعنی ایک طرف ان دونوں کی وجہ سے عزم، شجاعت اور اقدام کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں جن سے زندگی قوت و توانائی حاصل کر لیتی ہے اور دوسری طرف معیار زندگی کے بت کی پرستش شروع ہو جاتی ہے اور جو دل تنہا اللہ کا جلوہ گاہ تھا اب اس کی تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس حدیث میں اُمت مسلمہ کو یہ تعلیم ہے کہ وہ دنیا کو مقصود بنا کر اس پر نظر نہ جمائے بلکہ دوسرے جہان و آسمان پر اس کی نظر رہے جو اس سے کہیں زیادہ ارفع و اعلا ہے، بعض لوگوں نے اس قسم کی حدیثوں سے ترکِ دنیا پر دلیل قائم کی ہے، گویا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُمّت مسلمہ کو تارک الدنیا بنا کر ننگے بھوکوں کی ایک کالونی آباد کرنا چاہتے تھے حالانکہ اس مفہوم کا حدیث سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ دعا کی کہ خدایا میری قوم سے سب کچھ چھیننا مگر عقل نہ چھیننا، اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اے موسیٰ علیہ السلام ہم کسی سے چھیننے والے ہوتے ہیں تو اس کی عقل ہی کو سب سے پہلے چھینتے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فتنہ کے زمانے کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا۔

قلت فقهاء کم و کثرت قرآء کم وتفقه لغیر الدین والتمست الدنیا بعمل الآخرة۔ (ترغیب و ترهیب)	تم میں دین کی سمجھ رکھنے والے کم ہو جائیں گے اور پڑھنے والے بہت ہوں گے اور غیر دین کے لیے سمجھ حاصل کی جائے گی اور عملِ آخرت کے ذریعہ دنیا تلاش کی جاتے گی۔

نئی صدی ہجری کی پہلی عید

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔
امّا بعد:

حضرات! آج نئی صدی ہجری کی پہلی عید ہے۔ اس موقع پر صدی کی رہنمائی سے متعلق کچھ باتیں عرض کی جاتی ہیں۔ یہ باتیں اگرچہ بظاہر سخت ہیں لیکن درد آشنا کی نظر درد پر ہونی چاہیے نہ کہ اس کے اظہار کے طریقے پر۔

غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس دنیا پر اس صدی کا سورج طلوع ہوا ہے وہ وہ دنیا نہیں ہے جس کو ہم نے اپنے ہاتھوں بنایا اور سجایا تھا بلکہ وہ ہے جس کے نظریات نے ایمان و اعتقاد کی بنیادیں ہلا دی ہیں اور جس کے معاشرے نے مذہب و زندگی کے ہر شعبہ میں بیشمار نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔

اسی طرح مخاطب بھی وہ نہیں ہیں جو قوی و توانا تھے۔ جن کی ضرورتیں محدود تھیں اور ضرورتوں کا موجودہ ذخیرہ وقت اور موسم کے لحاظ سے کافی تھا، بلکہ وہ ہیں کہ مسلسل کمزوری کی وجہ سے جن کے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو گیا ہے۔ ان کی ضرورتیں بھی وسیع اور نوع بنوع ہیں اور ضرورتوں کے نئے ڈبے اور پیکٹ بھی وجود میں آ گئے

ہیں جن سے صرف نظر کرنا اس خطرہ کو دعوت دینا ہے کہ مخاطب مشروب پینے سے بھی انکار کر دے۔

دنیا کی وسعت اور مخاطب کی مزاجی کیفیت کو دیکھتے ہوئے نئی صدی کو رہنمائی عطا کرنے کا کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ پہلے جو کام ایک گوشہ میں ہوتا تھا اب اس کے لیے ایک وسیع میدان ہے پہلے ایک فرد کی صلاحیت کافی ہوتی تھی اب تقسیم کار کے بغیر چارہ نہیں رہ گیا۔ پہلے تجدید دین کی بات ایک معاشرے تک محدود تھی اب اس کا تعلق ایک "دور" سے ہو گیا ہے ایسی حالت میں جب تک ہمہ جہتی پروگرام نہ ہو کسی ایک گوشہ میں رہنمائی سے ملت کی ضرورتیں نہ پوری ہوں گی۔

موجودہ رہنمائیاں اپنے اپنے انداز میں قابلِ قدر ہونے کے باوجود اس قدر محدود اور تنگ ہیں کہ زندگی کے جدید حالات و معاملات کے لیے نہ ان میں گنجایش ہے اور نہ مختلف ضرورتوں کے لیے ان کا دامن وسیع ہے۔ پھر ان کا اثر و نفوذ بھی انھیں ممالک میں زیادہ ہے جن میں قدیم سرمایہ داری یا شاہی نظام قائم ہے یا معاشی ناہمواری کا مسئلہ شباب پر ہے اس بنا پر ملت کے قاموس نگاران رہنمائیوں سے زیادہ مطمئن نہیں ہیں بلاشبہہ سرمایہ داروں اور مذہبی نمایندوں کے اشتراک و تعاون سے اس وقت بہت سے مسائل دب گئے ہیں اور اوپر کی سطح ہموار نظر آنے لگی ہے جس کو دیکھ کر سطح بیں نظریں دھوکے میں مبتلا ہیں لیکن حقیقت بیں نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہنی چاہیے کہ توانائیوں کا گلا گھونٹ کر جن مسائل

کو دبا دیا جاتا یا حل کیا جاتا ہے، وہ ختم نہیں ہوتے ہیں بلکہ نئے میدان کی تلاش میں سرگرداں رہتے اور موقع پا کر نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ حملہ آور ہوتے ہیں۔

رہنمائی کے لیے مذہب کے صحیح تصوّر کا مسئلہ کم اہم نہیں ہے غلط تصور ہی کے نتیجے میں اس کے نام پر دین و دنیا کی تقسیم اس طرح ہے کہ ہر قدیم شے دین اور ہر جدید شے دنیا کے نام سے موسوم ہے منطق و قدیم فلسفہ دین ہے سائنس و جدید فلسفہ دنیا ہے۔ تیر اندازی بنوٹ دین ہے۔ این سی سی و فوجی تربیت دینا ہے انفرادی ملکیت کا تصوّر دین ہے اجتماعی تنظیم کا تخیل دنیا ہے عبادت و اخلاق کی تعلیم دین ہے ریسرچ و تحقیق کی تلقین دنیا ہے مکتب و مدرسہ کی ملازمت دین ہے کالج و یونی ورسٹی کی ملازمت دنیا ہے دعوت و تبلیغ کا کام دین ہے اور حالات و زمانہ کی رعایت دنیا ہے غرضیکہ جس پر قدامت کی چھاپ ہو وہ سب دین اور جس کو جدّت کی ہَوا لگی ہو وہ سب دنیا ہے۔

نہایت دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مذہب کا یہ تصوّر مسلمانوں کو رہنمائی کے قابل تو کیا بنائے گا زندہ رہنے کے قابل بھی نہیں بنا سکتا لا محالہ اس کی وجہ سے مذہب کو مسجد و مدرسہ کی چہار دیواری میں محدود رہنا پڑے گا اور صرف سکون حاصل کرنے کے لیے اس کے آستانہ پر حاضری ہوتی رہے گی۔ حالانکہ اسلام اپنے ماننے والوں کو رہنمائی کے منصب پر کھڑا کرنے کے لیے آیا ہے ورنہ دوسرے بہت سے مذاہب موجود تھے جن سے لوگوں کو سکون حاصل ہو جاتا تھا اگرچہ وہ موت کا سکون تھا زندگی کا نہ تھا۔

رہنمائی کے لیے مذہب کے ساتھ وفاداری کا مسئلہ بھی کافی مشکل ہے۔ اس کے ساتھ غداری کی مثالیں ایسی بے شمار ہیں کہ اچھے خاصے مذہبی لوگ مذہب کو اپنی کاربرآری کے لیے استعمال کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اس پر عمل کرنے کے لیے صرف وہ محدود اور بے خطر دائرہ رہ گیا ہے کہ جس میں اپنے مفاد و ذاتی اغراض سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا ورنہ جہاں معمولی ٹکراؤ نظر آیا مذہب کو خیرباد کہہ کر اپنا مفاد حاصل کرلیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تسبیح و سجّادگی پیری مریدی اور جماعتی زندگی سے وابستگی زوروں پر ہے اور دوسری طرف مکروفریب جھوٹ و دغابازی، مفت خوری وکام چوری ضمیر فروشی و رشوت ستانی اور زندگی کے گوشوں میں اسمگلنگ کی بھی کمی نہیں۔

مسجد میں تو اللہ کی عبادت کرلی جاتی ہے (گویا یہ سب مذہبی جدوجہد اسی لیے ہے) لیکن گھراور دکان، بازار و آفس عہدہ، ملازمت اور مسند واقتدار وغیرہ میں اللہ کی عبادت کے بجائے کھلے بندوں اپنے مفاد و اغراض کی عبادت ہوتی ہے اس پر نہ کسی کا ضمیر ملامت کرتا اور نہ ہی مذہبی معاشرہ کوئی گرفت کرتا ہے میکاولی (نظریہ قومیت کا موجد) بدنام ہے کہ اس نے سیاست وحکومت کی خاطر ہر قسم کے اصول و اخلاقی ضابطوں کی مخالفت روا رکھی ہے اب ذاتی اغراض و مفاد حاصل کرتے ہیں ہر شخص میکاولی بنا ہوا ہے لیکن اس میں نہ کسی کی بدنامی ہے اور نہ کوئی قابلِ ملامت ہے۔

اس غداری کے ساتھ ظاہر ہے کہ کوئی مذہب رہنمائی تو کیا کرتا زندگی میں خوشگوار تبدیلی بھی نہیں لاسکتا ہے۔

نئی صدی کو مذہبی رہنمائی دینی ہے تو لازمی طور سے مذہب کا صحیح تصور عام کرنا ہوگا اور اس کے ساتھ غداری کو ختم کرنا ہوگا۔ پھر اس کی قولی و عملی ترجمانی اس انداز سے کرنی ہوگی کہ لوگوں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ صرف عید میلاد کے جلسے جلوس مدارس کے چندہ نفلی حج و قربانی لٹریچر کی نشر و اشاعت اور مذہبی نمایندوں کی خاطر تواضع اور ان کے لیے نذرانہ و تحائف وغیرہ سے مذہبی سند مل جاتی ہے بلکہ اس کو بنیاد بنانا ہوگا کہ جب تک اپنے مفاد کو قربان کرکے دوسروں کا سروسامان نہ ہو اور دوسروں کی دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کی خاطر ذاتی و خاندانی مفاد قربان اور نقصان برداشت کرنے کا توصلہ نہ ہو اس وقت نہ کوئی صحیح معنوں میں مذہبی بنتا ہے اور نہ مذہب کی کوئی قابل قدر خدمت انجام پاتی ہے۔

نئی صدی کو اس وقت جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ روحانیت کی چاشنی ہے اس کے حصول کے لیے طویل طریقوں پر عمل سردست دشوار ہی سمجھا جائے۔ مقررہ احکام کی بجا آوری کے ساتھ آہِ سحر گاہی کا التزام بڑی حد تک کفایت کرسکتا ہے۔

اس کی شہ رگ پر جس چیز کا براہ راست حملہ ہے وہ اقتصادی بدحالی و معاشی ناہمواری ہے۔ اس کے لیے موجودہ دور کی معاشی مساوات کو سامنے رکھ کر ہی اسلامی عدل و اعتدال کے احکام وضع کرنے ہوں گے قدیم سرمایہ داری و جاگیرداری کو بنیاد بناکر عدل و اعتدال کی آواز سے رہنمائی کی ذمہ داری سے سبکدوشی نہ ہوسکے گی۔ اوپر مشکلات کی نشان دہی اس لیے نہیں ہے کہ پست ہمتی پیدا ہو اور اٹھا ہوا قدم رک جائے بلکہ اس لیے ہے کہ حالات کا صحیح تجزیہ کرکے اور مضبوطی کے ساتھ قدم اٹھایا

جائے۔

اگر مجھے معاف کیا جائے تو ایک بات اور عرض کر دوں وہ یہ کہ نئی صدی کی رہنمائی کے لیے مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ رندانہ جرأت کی ضرورت ہے زاہدانہ ہمت اور واعظانہ مصلحت سے کام نہ چل سکے گا۔

نئی صدی ہجری کی دوسری عید

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ
اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ

حضرات! آج نئی صدی ہجری کی دوسری عید ہے جس کو عید الاضحیٰ یا بقر عید کہا جاتا ہے جس طرح پہلی عید اُمتِ مسلمہ کے اصولوں کی نمایندگی کر رہی تھی یہ اس کی طرزِ زندگی کی نمایندگی کرتی ہے۔

یہ طرز زندگی ایک لفظ "قربانی" میں سمویا ہوا ہے جس کا مظاہرہ اسلام کی شکل میں مطلوب ہے۔ چنانچہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی عظیم الشان قربانی کے تذکرہ میں ہے:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ (صٰفٰت)

جب ان دونوں نے اسلام کا مظاہرہ کیا اور ابراہیمؑ نے اسمٰعیل کو پیشانی کے بل لٹا دیا

اسلام کے معنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دینا۔ باپ بیٹے دونوں اس میں پورے اُترے باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے چھری نکال لی اور بیٹے نے ذبح ہونے کے لیے گردن پیش کر دی۔ اس حقیقی مظاہرہ کو ہماری قربانی کی شکل میں اس لیے باقی رکھا گیا کہ جذبۂ خلیلؑ کی یاد تازہ

رہے اور اسلام کی حیثیت ہمیشہ نظروں کے سامنے رہے۔

قربانی اگرچہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے چلی آرہی ہے لیکن جو عظمت واہمیت اور وسعت وہمہ گیریت اس قربانی کو حاصل ہے وہ کسی اور کو نہ حاصل ہوسکی اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ اسلام کی تمام تر حقیقت اس کی نمایندگی کے لیے موجود ہے۔

نئی صدی ہجری کو اسلامی رہنمائی دینے کے سلسلے میں کن کن گوشوں میں کس کس طرح کی قربانی درکار ہے اس کو سمجھنے کے لیے مسلم معاشرے کی پچھلی زندگی پر سرسری نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے اس سے موجودہ زندگی کو سمجھنے اور اس میں قربانی کی راہ متعین کرنے میں سہولت ہوگی۔

مسلم معاشرہ ایسے حالات سے دوچار ہوا کہ اس کی زندگی کا سب کچھ لٹ گیا وہ بیمار ہوا اور بیماری آخری ڈگری تک پہنچ گئی اس میں جو جراثیم اور بیماریاں سرایت ہوئیں وہ کسی بھی معاشرے کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کافی تھیں۔

مثلاً غربت وافلاس، خالی دماغ و بے حس دل، ذات پات اور رسم ورواج کی لعنتیں مفت خوری وکام چوری کی عادتیں، ذاتی مفاد واغراض کی پرستش، عجائب پرستی وقسمت کا ماتم، جوانوں و نوجوانوں تک میں مایوسی، حکمران جن کا عزازیل (شیطان) سے سمجھوتہ ہوچکا تھا قائدین جن کا حکمرانوں سے معاہدہ ہوچکا تھا۔ امرا جن کی عیاشی کی داستانیں ضرب المثل تھیں، مذہبی طبقہ جس کی باہمی دست وگریبانی تھی، مذہب جس میں شرک ونفاق کی آمیزش تھی، مذہب جس میں دین ودنیا کی تقسیم تھی اور ان سب کے ساتھ رب العٰلمین رحمۃ للعٰلمین ہدیً للناس اور شفاءٌ للناس

جیسے نام بھی موجود تھے۔

یہ معاشرہ سسکیاں لے رہا اور دم توڑ رہا تھا لیکن جان بچانے کی کوشش میں برابر مصروف رہا۔

نئی صدی ہجری کو اسلامی رہنمائی دینے کے لیے، پچھلی زندگی میں جان بچانے کی کوشش پر بھی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے کہ اس سے بھی موجودہ زندگی کے لیے قربانی کی راہ متعین کرنے میں سہولت ہوگی۔

جس وقت مسلم معاشرہ کی یہ حالت تھی دوسری طرف ایک قوی و توانا معاشرہ موجود تھا جو اس کی زندگی کے سابقہ روشن اور موجودہ تاریک پہلو سے روشنی و عبرت حاصل کر کے قوی و توانا ہوا تھا اور زمانہ کا رخ موڑ کر ایک نئے دور کا آغاز کر دیا تھا۔

اس دوسرے معاشرہ کے پاس دولت، حکومت، تصورات، نظریات، ایجادات، اختراعات، علم و فن فلسفہ و سائنس، حسن کی نمایش، جوانی کی امنگ محبت کی فراوانی اور ہوس کی حکمرانی وغیرہ ساری چیزیں موجود تھیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے قدموں پر مہ و انجم کی جبینیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے عشرت خانوں میں پھولوں کی سیجیں بچھی ہوئی تھیں اس کے قبضہ میں سرمستی کی جاگیریں تھیں اور ان سب کے ساتھ لوریاں دینے کے لیے گرجا پادری انجیل مقدس اور اقانیم ثلثہ (باپ بیٹا اور روح القدس) بھی موجود تھے۔

یہ بیچارہ مسلم معاشرہ جس میں نہ ضبط و تحمل کی طاقت تھی اور نہ مدافعت و مزاحمت کی ہمت، اپنی جان بچانے کے لیے اس معاشرے کی گود میں جا بیٹھا اور اپنی انفرادیت و ملی خصوصیت کی بھی پروا نہ کر سکا

ہر جاں بلب معاشرے میں قدرت کچھ غیرت مند قوتوں کو باقی رکھتی ہے جن کے ذریعہ مؤرخ و قاموس نگار تاریخ کے نوک پلک درست کرتے اور اس کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہیں۔ مسلم معاشرے میں بھی کچھ قوتیں موجود تھیں جو غیر کی گود میں اس طرح بیٹھ جانے کو گوارا نہ کر سکیں چنانچہ بالغ نظر علما نے روکا صاحبِ دل صوفیہ نے دعا کی اور دانشوروں نے سمجھایا لیکن یہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو سکا۔

نئی صدی ہجری کو اسلامی رہنمائی دینے کے لیے قانون فطرت اور تاریخی جبریت کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس سے بھی قربانی کی راہ متعین کرنے میں سہولت ہوگی۔

یہ دنیا عالمِ کون و فساد ہے۔ یہاں ہر بگاڑ کے ساتھ بناو اور ہر تخریب کے ساتھ تعمیر ہے۔ خود فطرت ہر گوشہ میں کانٹ چھانٹ کرتی اور خوب سے خوب تر شئے کو فِٹ کرتی ہے جب کوئی شئے ایک جگہ فٹ ہو گئی تو کم تر شئی کے لیے وہ جگہ نہ چھوڑے گی بلکہ قبضہ کے لیے اس سے بلند و بر تر شئے کا ہونا ضروری ہے۔ فطرت کا یہ قانون اس وقت زیادہ نمایاں ہوتا ہے جب تاریخ نیا موڑ لیتی ہے اور اس کے جلو میں بے شمار نئے خیالات و احساسات جنم لیتے اور نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ ایسے موقع پر ان سے صَرفِ نظر کرنا اپنی موت کے پروانہ پر خود ہی دستخط کرنا ہوتا ہے۔

اس نئے موڑ کی مناسبت سے جس قسم کے کام کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے میکانیکی صلاحیتیں ناکافی سمجھی جاتی ہیں کہ ان سے کسی جدید فکر، جدید علم اور جدید اسلوب کی نمایندگی کرنے کی توقع بے سود ہے

بلکہ اس کے لیے تخلیقی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں جو یہ دیکھتی ہیں کہ موجودہ خیالات اور چیزوں میں کس کو لینا اور کس کو چھوڑ دینا ہے، کس میں کانٹ چھانٹ کرنا اور کس سے نظر بچا کر نکل جانا ہے، کس کو بعینہ باقی رکھنا اور کس کو بالکلیہ نظر انداز کر دینا ہے، کس میں نئی روح ڈالنا اور کس کے لیے نیا قلب تیار کرنا ہے۔ عبوری مرحلہ کس طرح گزارنا اور ہنگامی حالات کا کیسے مقابلہ کرنا ہے غرض اس طرح نظر ڈال کر وہ صلاحیتیں ماضی اور حال کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی اور بہتر مستقبل کے لیے راہ عمل متعین کرتی ہیں۔

بدقسمتی سے مسلم معاشرہ میں یہ کام اب تک نہ ہو سکا۔ بلاشبہ مختلف جگہ بعض تخلیقی صلاحیتوں نے یہ کام کرنا چاہا لیکن میکانیکی صلاحیتوں نے بیمار معاشرہ کی مدد سے ان کو کچل کر رکھ دیا۔ اب میدان صاف ہے اس میں صرف وہی طبقہ مسلم معاشرہ کی رہنمائی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے جس کے پاس تاریخی موڑ کی مناسبت سے نہ تعمیری ذہن ہے اور نہ جدید حالات و معاملات سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ بس جو کچھ اور جس حالت میں دور زوال سے چلا آرہا ہے اسی کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے لیے جہاد اور اجتہاد ہے اور اسی کا وہ مجاہد و مفکر ہے اس کی نظر اس لاوے پر بھی نہیں ہے جو پھٹنے اور پھوٹنے کے لیے بے چین ہے جس سے خود اس کی زندگی کو خطرہ ہے۔

مذکورہ کام کے لیے جس قسم کی قربانی کی ضرورت اور کس کے مقابلہ میں ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ تخلیقی صلاحیت والے اس کے لیے کس حد تک تیار ہیں وہ بھی اہل نظر سے مخفی نہیں ہے ابھی تو

وہ دل کی ان چوٹوں ہی سے بے چین ہیں جو میکانیکی صلاحیت والوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً انھیں پہنچتی رہتی ہیں۔

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے سونے نہ دیا
جب چلی ٹھنڈی ہوا میں نے انھیں یاد کیا

لیکن سردست ان کی صلاحیتوں کا عظیم مصرف یہ ہے کہ ان سے فکر و نظر کو غذا ملتی اور اس اونچے دانشور طبقہ کی دلجوئی و رہنمائی ہوتی ہے جو کسی کے قابو میں آنے والا نہیں ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے شاید اسی لیے فرمایا ہے۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اپنے دائرے میں فکر و نظر کا یہ کارواں بھی دھیمی رفتار سے سفر جاری رکھے ہوئے ہے اگرچہ مادّی منفعت اس کے جلو میں نہیں ہے صرف قربانی ہی اس کے اوّل و آخر ہے۔

جلوۂ کاروانِ ما نیست بناقہ و جرس
شوقِ تو راہ می برد وِردِ تو زاد می دہد

عبادت و ریاضت کا نذرانہ

حضرات ! آج عید کا دن ہے جس کے معنیٰ اس خوشی و مسرّت کے ہیں جو لوٹ لوٹ کر بار بار آتی ہے۔ ہماری ملّی زندگی میں یہ دن نہایت متبرک و مقدّس ہے اس کے استقبال کے لیے فرشتے جیسی نورانی مخلوق کو شاہراہوں اور گزرگاہوں پر متعیّن کیا جاتا ہے جو یہ صدا لگاتے رہتے ہیں:

یا امۃ محمد اخرجوا الی رب کریم یعطی الجزیل ویعفوا عن العظیم۔	اے محمدؐ کی اُمّت نکلو نہایت سخی پروردگار کی طرف جو بکثرت دیتا اور بہت درگزر کرتا ہے۔

پھر جب بندہ اس صدا پر لبیک کہتے ہوئے عبادت و ریاضت کا نذرانہ لے کر اللہ کے حضور حاضر ہو جاتا ہے تو اللہ فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

ماجزاء الاجیر اذا عمل عملہ۔	اس کارندے کو کیا صلہ دیا جائے جو اپنا کام پورا کرلے۔

فرشتے جواب میں عرض کرتے ہیں۔

الھنا وسیدنا فجزاءہ — ہمارے معبود، ہمارے آقا اس کا
ان توفیہ اجرہ — صلہ یہ ہے کہ کام کا پورا پورا
بدلہ دیا جائے۔

پھر اللہ فرشتوں سے کہتا ہے کہ
"تم گواہ رہو جو کچھ دن کے روزوں اور رات کی نمازوں
سے ثواب ملا ہے میں نے اس کے بدلے میں اپنی رضا
و مغفرت عطا کر دی"۔
اور بندوں سے کہتا ہے۔
"مجھ سے مانگو۔ میری عزت و جلال کی قسم آج تم اپنی
آخرت کے لیے جو مانگو گے میں اس کو ضرور دوں گا اور
دنیا کے لیے جو مانگو گے اس پر بھی غور کروں گا"۔
بندۂ مومن کی سب سے بڑی جنت مغفرت و اللہ کی رضامندی ہے
وہی مطلوب اور اسی کی رضا مقصود ہے۔
لیکن اس "جنت" کو حاصل کرنے کے لیے روزہ دار رہنا ضروری
ہے کہ اس کی جائز ضرورتیں اور ضروری خواہشیں بھی اپنی مرضی کی نہ رہ
جائیں بلکہ اللہ کی مرضی کی ہو جائیں۔

مکتب میں عاشقی کے پہلا یہی سبق ہے
جو میں کہوں سو باطل جو تم کہو سو حق ہے

عید کے دن کی جس قدر رحمتیں و برکتیں ہیں وہ دراصل مہینا
بھر کی اس عبادت و ریاضت کا نتیجہ ہیں جس کا نذرانہ پیش کرنے
کے لیے بندۂ مومن اللہ کے حضور حاضر ہے۔ دوسرے لفظوں

ہیں یوں کہیے کہ یہ رحمتیں و برکتیں ان اعمال کے خواص ، اثرات ثمرات اور نتائج ہیں جو دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں انجام دیے جاتے رہے ہیں جن سے زمین کی ہوا اور فضائیں بھی عطر بیز ہوتی رہیں، اور آسمان کے محرمِ راز (فرشتے) بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔

چیزوں کی طرح اعمال کے بھی خواص و اثرات ہیں جس طرح مفید و مضر چیزوں کے استعمال سے فائدہ و نقصان کی شکل میں ان کا خاصّہ و اثر مرتّب ہوتا ہے اسی طرح اچھے بُرے کام کرنے سے بھی اچھے بُرے نتیجہ کی شکل میں ان کا خاصّہ و اثر مرتب ہوتا ہے مذہب کی زبان میں جس کا نام ثواب و عذاب ہے وہ دراصل یہی اعمال کے خواص، اثرات، ثمرات اور نتائج ہیں اسی بنا پر قرآنِ حکیم نے ان کو کسب اور کمائی سے تعبیر کیا ہے۔

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ (طور آیت ۲۱)	ہر انسان اپنی کمائی کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔
لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ (بقرہ آیت ۲۸۶)	انسان کو اسی کا فائدہ ہے جو اس نے کمایا اور اسی کا نقصان ہے جو اُس نے کمایا۔

چیزوں کے خواص و اثرات تک تو ایک درجہ میں موجودہ علم و فن کی رسائی ہو گئی ہے، لیکن اعمال کے خواص و اثرات سے ابتدائی درجہ کی بھی واقفیت نہیں ہو سکی۔ حیرت ہے کہ اس سلسلہ میں بڑے سے بڑے اجتماعیات کے ماہر کو اتنی بھی واقفیت نہیں

جتنی کہ زمانۂ جاہلیت کی ایک خاتون کو تھی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ غارِ حرا میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نزولِ وحی کے وقت کی نورانی کیفیت کا جو پہلا تجربہ ہوا اور جس کے نتیجے میں آپؐ نے گھبرا کر اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ سے فرمایا۔

لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ — مجھے اپنی جان کے بارے میں خطرہ ہے۔

(بخاری ج ۱ باب الوحی)

اس پر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے اعمال گِنا کر ان کے خواص واثرات کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس شخص کے اس قسم کے اعمال ہوں گے اللہ اسے ذلیل ورسوا نہ کرے گا۔ حضرت خدیجہؓ کے الفاظ یہ ہیں۔

کلا واللہ لا یخزیک اللہ ابداً انک لتصل الرحم وتصدق (الحدیث) وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔

(بخاری)

میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ آپ کو اللہ ہرگز رسوا نہ کرے گا آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں سچی بات کہتے ہیں لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور نادار کو کمائی کے قابل بناتے ہیں اور مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے معاملہ میں جو حوادث پیش آتے ہیں اس میں آپؐ مدد کرتے ہیں۔

اعمال کے خواص واثرات سے جدید دنیا کی اس بڑھی ہوئی بے حسی کی غالباً وجہ یہ ہے کہ اس نے چھٹی حِس سے نہ واقفیت حاصل

کی اور نہ اس سے کام لینے کی اہمیت تسلیم کی جس کے نتیجہ میں فطرت کے وہ نغمے خاموش ہو گئے جو زندگی کے ساز میں سوز پیدا کرتے ہیں پھر کیا ہوا ؟

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا ہی نہیں اپنے کو کھو آئے

یہ خواص و اثرات اگر اس دنیا میں کسی وجہ سے نہ دکھائی دیں تو اُس دُنیا (مرنے کے بعد) میں یقیناً دکھائی دیتے ہیں اور دونوں میں فاصلہ اس قدر کم ہے کہ زیادہ انتظار کی زحمت نہیں گوارا کرنی پڑتی۔

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے بڑھیں گے دَم لے کر

پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس دنیا کے نظم و انتظام کی وجہ سے عارضی طور پر بعض اعمال کے خواص و اثرات روک لیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے جلد باز طبیعتیں ان کے نہ ہونے کا فیصلہ کر لیتی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں۔

وَرُبما کان حکم النظام	بسا اوقات نظم و انتظام کا حکم
اوجب من حکم الاعمال	اعمال کے حکم (خواص و اثرات)
فیستدرج الظالم	کے مقابلہ میں زیادہ ضروری ہوتا
و یضیق علی الصالح	ہے اس بنا پر گنہگار کو ڈھیل دی
فی الظاہر و یصرف التضیق	جاتی ہے اور نیکو کار پر بظاہر
الی کسر غرائزۃ البھیمۃ	تنگی کی جاتی ہے اور یہ تنگی اس
	کی حیوانی قوتوں کے توڑنے میں

کام آتی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغۃ باب الجزا ر)

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قدرت کسی بندے سے کوئی خاص کام لینا چاہتی ہے اور عام حالات میں وہ کام نہیں لیا جا سکتا تو اس کے لیے ابتلا و آزمائش کے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں جن کے ذریعہ ذہنی و فکری آبگینہ کو پتھر سے کچلا جاتا اور وہ چمک پیدا کی جاتی ہے جو اس خاص کام کے لیے درکار ہے اگرچہ مرزا مظہر جانِ جاناں کے الفاظ میں یہ کہا جاتا رہے۔

بجائے سنگ طفلان پارہائے شیشہ باید زد
چو مظہر جانِ جاں دیوانہ، نازک طبیعت را

اس اثنا میں اگر بعض اعمال کے خواص و اثرات شروع کے جائیں تو وہ چمک نہ حاصل ہو سکے گی جو اس کام کے لیے مطلوب ہے پھر وہ عظیم کام نہ لیا جا سکے گا جو قدرت کو اس سے لینا مقصود ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے اعمال کے خواص، اثرات ثمرات اور نتائج پر اتنی نفیس اور شاندار بحث کی ہے کہ اس کو دیکھ کر دل کو سرور اور روح کو تازگی حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کی روح قبض کرنے موت کا فرشتہ آچکا تھا لیکن اس نے اپنے ماں باپ کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ آیا اور اس نے موت کے فرشتے کو واپس کر دیا۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ خستہ حالت میں پڑا ہوا ہے اللہ اور اس کے درمیان بڑا حجاب حائل ہے لیکن اس کا حُسن

خلق آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اللہ کے قریب کر دیا۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ عذاب کے فرشتے اس کو گھیرے ہوئے ہیں لیکن نماز نے آکر اس کو ان سے بچالیا۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ آگ کی لپٹ اور اس کے شعلوں سے بچنا چاہتا ہے اور بچ نہیں رہا ہے لیکن اس کا صدقہ آیا اور وہ اس کے اور شعلوں کے درمیان حائل ہو گیا اور اس کے سر پر سایہ کر لیا۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں اوپر نیچے تاریکی ہی تاریکی ہے اور اس میں وہ حیران و پریشان کھڑا ہے لیکن اس کا حج و عمرہ آیا اور تاریکی سے نکال کر اس کو نور میں داخل کر دیا۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اللہ کے بندوں سے بات کرنا چاہتا ہے اور یہ لوگ اس سے بول نہیں رہے ہیں لیکن اس کی صلہ رحمی آئی جو عزیز و قریب اور رشتہ داروں کے ساتھ کی تھی اس نے آکر کہا کہ تم لوگ اس سے بات کرو یہ صلہ رحمی کرتا تھا چنانچہ ان لوگوں نے بات کی اور ہاتھ ملایا۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ عذاب کے فرشتوں نے اس کو گھیر رکھا ہے لیکن اس کا امر بالمعروف (اچھی باتوں کے کرنے کے لیے لوگوں سے کہنا) اور نہی عن المنکر (بری باتوں کے کرنے سے لوگوں کو منع کرنا) آیا اور رحمت کے فرشتوں میں اس کو داخل کر دیا۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ جہنّم کے گگر پر کھڑا ہے لیکن اس کی اچھی امید آئی جو اس نے اپنے اللہ سے قائم کی تھی اور اس نے جہنّم سے بچالیا۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کو جہنّم میں ڈال دیا گیا ہے لیکن اس کا وہ آنسو آیا جو اللہ کی یاد اور اس کے خوف میں بہا تھا اس نے اس کو جہنّم سے نجات دلادی۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ جنّت تک پہنچا اور اس کے دروازے بند کر دیے گئے لیکن اس کی شہادت آئی جو اس نے لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ کے ذریعہ پیش کی تھی اس نے دروازہ کھلوا کر اس میں داخل کر دیا۔

یہ چند خواص و اثرات ہیں جو بطور نمونہ ہیں، احادیث میں بکثرت ان کا تذکرہ ہے جس کی طرف توجّہ کرنے کی ضرورت ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اعمالِ خیر کی طرح اعمالِ شر (برے کام) کے بھی خواص و اثرات، ثمرات اور نتائج بیان کیے ہیں جن کو اگر بیان کیا جائے تو عید کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ پھر بھی اس قدر وضاحت ضروری ہے کہ ہمارے اعمالِ خیر کا نہایت محدود و بے خطر دائرہ رہ گیا ہے۔ یہ وہی دائرہ ہے جس میں اپنے مفاد و ذاتی اغراض سے کوئی ٹکراو نہیں ہوتا ورنہ جہاں معمولی ٹکراو نظر آیا ان کو خیر باد کہہ کر اپنا مفاد حاصل کر لیا گیا اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دیا گیا۔

میرے بھی صنم خانے تیرے بھی صنم خانے　　دونوں کے صنم خاکی دونوں کے صنم فانی

ادھر اعمالِ شر مثلاً مکر و فریب، کینہ و حسد، جھوٹ و نفاق ضمیر فروشی و رشوت ستانی، حق تلفی و ایذا رسانی وغیرہ کی حیثیت ایسے "جراثیم" کی ہے کہ بسا اوقات اعمالِ خیر کے خواص و اثرات کو بھی زائل کر دیتے ہیں۔ صحت بخش دواؤں اور غذاؤں کے فائدہ پہنچانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب "جراثیم" قابو پا لیتے ہیں تو تیز دوائیں اور مقوّی غذائیں بھی اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر اعمالِ خیر کے خواص و اثرات نہ دکھائی دیں تو اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ پردہ اُٹھ جائے اور لوگ اپنی اپنی پرستش کی جگہیں دیکھ لیں۔

بیفگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے رامی پرستند

نغمہ اور ترانہ

حضرات ! آج عید کا دن ہے جس کا نام عیدالاضحیٰ یعنی قربانی کی عید ہے۔ ہماری ملّی زندگی میں اس کی بڑی اہمیت ہے اس کی ہر ادا وفاداری و فداکاری، ایثار و قربانی، حق پرستی و جاں نثاری اور تسلیم و رضا کا نمونہ پیش کرتی اور عشق و محبّت کی یاد تازہ کرتی ہے۔

تقریب کی مناسبت سے اس کا نغمہ اور ترانہ بھی ہے جو اس کی خصوصیات کا نمایندہ اور جاذبیت و دلکشی میں اپنی مثال آپ ہے اس وقت انھیں دونوں کا تعارف مقصود ہے۔

نغمہ یہ ہے۔

لبیک اللّٰھم لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد

والنعمة لك والملك لا شريك لك ۔

(اے اللہ آپ کے دربار میں حاضر ہوں، آپ کے حضور میں حاضر ہوں، آپ کا کوئی شریک نہیں، آپ کی نیاز میں حاضر ہوں، بے شک ساری تعریفیں اور ساری نعمتیں آپ ہی کی ہیں ملک، اور اقتدار آپ ہی کا ہے۔ آپ کا کوئی شریک نہیں)

ترانہ یہ ہے۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد

(اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے ساری تعریفیں ہیں)

نغمہ کے تعارف کے لیے اس وقت کے منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے جب کہ خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد اللہ کی طرف سے سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کے اعلان کا حکم ہوا تھا۔ قرآنِ حکیم میں ہے۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ [۱]	لوگوں میں حج کا اعلان کر دو لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی دور دراز پہاڑی راستوں سے پہنچیں گے۔

سار ی دنیا کے لیے حج کے اعلان کا حکم وہ بھی بیابان وسنسان

[۱] سورہ حج آیت ۲۶

میدان میں جس کے سُننے والے باہر ملک کے تو کیا ہوتے خود اسی ملک اور اسی جگہ کے کتنے تھے؟ پھر دور دراز آواز پہنچانے کے لیے براڈ کاسٹ اسٹیشن و تار برقی کے ذرائع جو اِس وقت موجود ہیں ان میں سے کسی ایک کا بھی اس وقت تصوّر نہ کیا جاسکتا تھا۔ فطری طور پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنی بے بسی و بے چارگی کا احساس ہوا اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا۔

یا ربّ کیف ابلّغ الناس و صوتی لاینفذھم ؎۲	اے میرے رب میں لوگوں تک آواز کس طرح پہنچاؤں جب کہ میری آواز ان تک نہ پہنچ سکے گی۔

جواب میں ارشاد ہوا۔

نادوا علینا البلاغ	تم زور سے پکار کر کہہ دو آواز پہنچانے کی ذمہ داری ہماری ہے

یعنی اے ابراہیمؑ تم اس مادّی دنیا کی بے بسی و بے چارگی کو یاد کر رہے ہو۔ تمھیں یہ معلوم نہیں کہ تم اس وقت براڈ کاسٹ کے لاہوتی اسٹیشن پر کھڑے ہو اور نورانی میٹر تمھارے سامنے ہے۔ تمھارا کام صرف آواز لگا دینا ہے اور بس۔ چنانچہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے ان الفاظ میں حج کا اعلان کیا۔

ایھا الناس ان ربّکم اللہ	اے لوگو! تمھارا رب اللہ ہے۔

؎۲ تفسیر ابن کثیر سورہ حج آیت ۲۶۔

فذ ا تخذ بیتاً فجوہ — اس نے گھر بنایا ہے اس کا حج کرو۔

ان کا یہ اعلان و پیام ہر برّاعظم کے ایک ایک گوشہ، سمندر کے ایک ایک جزیرہ تک پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ روایتوں میں آتا ہے کہ رحم مادر کے ان بچوں نے بھی سن لیا جنھوں نے اس مکر و فریب کی بنیاد میں ابھی قدم نہیں رکھا تھا۔ ۳؎

یہ نغمہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسی اعلان و پیام و نورانی صدا کا جواب ہے۔ جو ہر حاجی کی زبان پر ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اپنے مقبول ترین بندے سے آواز دلوا کر ہمیں بلوایا ہے، ہم آپ کے دربار میں دل و جان سے حاضر ہیں۔ چنانچہ احرام باندھنے کے بعد سب سے پہلا مرحلہ خانۂ کعبہ کے طواف کا ہوتا ہے جس کا نام طوافِ قدوم (دربار میں حاضری کا طواف) ہے۔ جو یہ دعا پڑھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔

اللّٰھمّ ایمانا بک وتصدیقاً بکتابک ووفاء بعھدک واتباعاً لسنۃ نبیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔	اے اللہ میں آپ کے دربار میں حاضر ہوں آپ پر ایمان کے ساتھ آپ کی کتاب کی تصدیق کے ساتھ، آپ کے عہد کو وفا کرتے ہوئے اور آپ کے نبیؐ کی سنت کی اتباع کرتے ہوئے۔

دربار میں حاضری کی یہ بات تو ان سے متعلق تھی جن کو اللہ نے حج و زیارت کی سعادت نصیب فرمائی لیکن جو لوگ وصال

۳؎ ایضاً۔ ص ۱۲۹

کی لذّت سے محروم اور فراق کی لذت میں مصروف ہیں ان کے دل کی بے تابی و بے قراری دربار کی حاضری میں بجائے خود بڑی اہمیت رکھتی اور اس اعتراف پر مجبور کرتی ہے کہ

میکشو مے کی کمی بیشی پہ ناحق جوش ہے
یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے

ترانہ کا تعارف یہ ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سخت سے سخت آزمائشیں ہوئیں اور ہر ایک میں نہ صرف وہ ثابت قدم رہے بلکہ تسلیم و رضا کے پیکر بنے رہے لیکن یہ آزمائش جس کا ترانہ کے تعارف سے تعلق ہے، اکلوتے بیٹے کی قربانی ہے جس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب سے ایک سعادت مند و صالح فرزند کی دعا کی اور وہ قبول ہوئی ان کو ایک ایسا فرزند عطا ہوا جو یگانۂ روزگار تھا بوڑھے باپ کی ضعیفی کا سہارا اور ابراہیمی سنّت باقی رکھنے کا واحد ذریعہ تھا۔ یہ فرزند ارمانوں اور تمنّاؤں کے سایہ میں پروان چڑھتا رہا۔ جب وہ بڑا ہو کر کسی قابل ہوا تو باپ کو اشارہ ہوا کہ اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا جائے۔ یہ اشارہ خواب میں ہوا تھا۔ انبیاء علیہم السلام کے خواب کی نوعیت دوسروں کے خواب سے بالکل جدا ہوتی ہے ان کے خواب کی دو قسمیں ہیں (۱) مثالی اور (۲) عینی۔

مثالی خواب میں حقیقت کو کسی پیرایہ میں سمجھایا جاتا ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے

اور ماہتاب و آفتاب ان کو سجدہ کر رہے ہیں۔ ایسے خوابوں کی تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ فوراً یہ تعبیر ظاہر ہو بلکہ کچھ دنوں کے بعد ظاہر ہوتی ہے جیسے یوسف علیہ السلام کے اس خواب کی تعبیر ایک عرصہ کے بعد ظاہر ہوئی اور انھوں نے دیکھ لیا کہ ان کی تعظیم کے لیے ان کے گیارہ بھائی اور ماں باپ سبھی جھک پڑے کہ جس کو دیکھ کر وہ کہہ اٹھے۔

يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ	اے ابا جان یہ میرے پہلے خواب
قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي	کی تعبیر ہے جس کو میرے رب نے
حَقًّا ؎	سچ کر دکھایا۔

یعنی خواب میں حقیقت بعینہٖ دکھائی دی جاتی ہے۔ مزید کسی تعبیر و تشریح کی ضرورت نہیں رہتی۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں اپنے بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بات بالکل صاف تھی جس میں اگرچہ تردّد کی گنجایش نہ تھی لیکن حیرت میں ڈالنے والی یقیناً تھی جس کی بنا پر آٹھویں ذی الحجہ (جس کی شب میں یہ خواب دیکھا تھا) کو شام تک اس حیرت انگیز بات پر غور و فکر کرتے رہے۔ اس تاریخ کو یوم الترویہ اسی بنا پر کہتے ہیں کہ ترویہ کے معنیٰ غور و فکر کے ہیں، پھر نویں تاریخ کی شب میں یہی حقیقت دکھائی دی جس کے بعد انھیں پوری معرفت ہو گئی اور سمجھ لیا کہ یہ حکم ہے جو خواب میں دکھایا گیا۔ نویں تاریخ کو عرفہ اسی بنا پر کہتے ہیں کہ اس کے معنیٰ پہچان اور معرفت

؎ سورہ یوسف آیت ۱۰۰

کے ہیں، پھر دسویں تاریخ کی شب میں یہی مشاہدہ کرایا گیا تو حکمِ الٰہی بجا لانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس تاریخ کو یوم النحر اسی بنا پر کہتے ہیں کہ نحر کے معنیٰ ذبح کرنے کے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے اس کا نقشا اس طرح کھینچا ہے۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ
يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ
اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا
تَرٰى قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ
مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ
اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ
فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ
لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنٰهُ
اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ
الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّ
هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا
الْمُبِيْنُ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ
عَظِيْمٍ لہ

جب حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو انھوں نے ایک دن کہا اے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تمھیں ذبح کر رہا ہوں غور کر لو تمھاری کیا رائے ہے۔ بیٹے نے بلا تامل کہا اے آبا جان آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اس کو کر گزریے آپ انشاء اللہ مجھے ثابت قدم رہنے والوں میں پائیں گے۔ پھر جب باپ بیٹے دونوں حکمِ الٰہی کے آگے جھک گئے اور باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے پیشانی کے بل پچھاڑ دیا (کہ سجدہ کی حالت میں ذبح کا کام انجام دیا جائے)

تو ہم نے آواز دی اے ابراہیمؑ بس کرو تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا ہم

لہ سورہ صفت آیت ۱۰۲ تا ۱۰۷

مخلصین کو اسی طرح صلہ (امتحان میں کامیابی) دیتے ہیں۔ بے شک یہ کھلا ہوا امتحان تھا اور ہم نے فدیہ میں بہت بڑی قربانی دی (قیامت تک جاری رہنے والی قربانی۔")

واقعہ کی مضمرات پر بحث اس وقت مقصود نہیں ہے ترانہ کا تعلق اس سے یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے اکلوتے بیٹے کو حکم کی تعمیل میں پچھاڑے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ نورِ نظر کی گردن پر جلد چھری چلا دیں، ادھر یہ لختِ جگر پیشانی زمین پر رکھے ہوئے جلوۂ الٰہی میں مصروف بزبان حال کہہ رہا تھا:

ترے جلووں کے آگے ہمّتِ شرح و بیاں رکھ دی۔
زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی

ایسی حالت میں حضرت جبرئیل امین تشریف لائے اور یہ منظر دیکھ کر بے اختیار ان کی زبان سے نکلا اللہ اکبر اللہ اکبر خلیل اللہ نے یہ سن کر جواب میں فرمایا لا الہ الا اللہ واللہ اکبر پھر جبرئیل و خلیلؑ کی زبان سے سن کر تسلیم و رضا کے پیکر ذبیح اللہ (حضرت اسماعیلؑ) کی زبان سے نکلا اللہ اکبر وللہ الحمد اس طرح آج کا ہمارا ترانہ تینوں بزرگوں کی زبان سے خاص حالت و کیفیت میں نکلے ہوئے متبرک الفاظ کا مجموعہ ہے۔

ہزاروں ہزار سلام و رحمت ایسے باپ بیٹے پر کہ جنھوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل کے لیے عزم و صبر اور تسلیم و رضا کے یہ نمونے قائم کیے۔

سچّائی کا پروگرام

حضرات! عید ہمارا مذہبی تہوار ہے۔ اس کی مناسبت سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی حقیقت واضح کردی جائے مذہب دراصل سچائی کے اس پروگرام کا نام ہے جو اللہ کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے ذریعہ آتا رہا ہے! اس کی حیثیت انکشاف حقیقت (Revelation of Truth) کی ہے۔ جو اپنی ذات سے خود ایک آئیڈیل ہے، محض سماجی عمل (Social Activity) کی نہیں ہے کہ جس کا اپنا کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا۔ جو چیز انکشاف حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے وہ ہمیشہ باقی رہتی اور اس کی روشنی میں زندگی اور سماج کا مطالعہ ہوتا رہتا ہے اور جو چیز محض سماجی عمل کی حیثیت رکھتی ہے وہ اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک سماج اس کی اجازت دیتا ہے اور اگر اس کی جگہ کوئی اور عمل یا طریقہ اختیار کرلیا گیا تو پھر وہ چیز تاریخی بن جاتی ہے۔

یہ سچائی کا پروگرام اللہ کی طرف سے ہر دور و زمانہ میں آیا اور جب تک ایمانداری کے ساتھ اس پر عمل درآمد باقی رہا

اس کو تازہ دَم بنانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، لیکن جب ذاتی اغراض و مفاد کا اس پر غلبہ ہو گیا اور لوگوں نے اس میں تبدیلی کر دی تو پھر اللہ نے از سرِ نو اس کو زندگی اور توانائی بخشی تاکہ اس کی قائدانہ حیثیت برقرار رہے اور اسی کے زیرِ سایہ زندگی اور سماج ترقی کی منزلیں طے کرتے رہیں۔

قرآنِ حکیم اور دوسری مذہبی کتابوں میں سچائی کا پروگرام لانے والے تمام پیغمبروں کا ذکر نہیں کیا گیا صرف انھیں کا ذکر ہے جن کی قوموں نے ابتدائی تمدّن کی تعمیر میں حصّہ لیا تھا اور جن کا ذکر و تذکرہ اس وقت کے لوگوں میں پایا جاتا ہے سب کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہدایت و رہنمائی منصب پر صرف ان کو تسلیم کر لینا کافی تھا۔ چنانچہ یہ موجود ہے۔ مثلاً:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ [1]	آپؐ سے پہلے بہت سے رسولوں کا ہم نے آپؐ سے ذکر کیا اور بہت سوں کا نہیں ذکر کیا۔
لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ [2]	ہر اُمّت کے لیے رسول آیا ہے۔
لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ [3]	ہر قوم کے لیے ہدایت کرنے والا آیا ہے۔

سچائی کا یہ پروگرام اس وقت تک برابر آتا رہا جب تک انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں میں پختگی اور خود اعتمادی نہیں پیدا ہو گئی اور جب یہ دیکھ لیا گیا کہ ان میں اس درجہ پختگی اور خود

---

[1] سورہ نساء آیت ۱۶۵ [2] یونس آیت ۴۷ [3] رعد آیت ۷

اعتمادی آگئی ہے کہ اب ایک "گائڈ بک" دے کر اور اس کی حفاظت کا بندوبست کر کے زندگی کے سفر کو جاری رکھا جاسکتا ہے تو اس سلسلہ کو بند کر دیا گیا اگر اس مرحلہ میں بھی سلسلہ کو جاری رکھا جاتا تو انسان کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچتی اور پھر تعمیر و ترقی کی وہ شکلیں نہ وجود میں آتیں جو سلسلہ بند کرنے کے بعد وجود میں آئی ہیں۔

سچائی کے اس پروگرام میں ہمیشہ یکجہتی رہی اور اس کی بنیادی تعلیمات میں کبھی اختلاف نہ رہا۔ مثلاً ایمان و اعتقاد، عبادت و فرماں برداری، طہارت و پاکی، نیکی و بدی، پاکیزگی و گندگی وغیرہ کے بیان کرنے میں یہاں تک یکجہتی برقرار رہی کہ ایک کا ماننا سب کا ماننا اور ایک کا انکار سب کا انکار قرار پایا۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ [1] — ہم رسولوں میں کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے ہیں۔

اختلاف اور بھید بھاؤ جو کچھ نظر آتا ہے وہ بعد کا پیدا کردہ ہے جس کو دور کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ مذہب کی اصل تعلیمات کو کھلے ذہن کے ساتھ تسلیم کیا جائے اور اس میں کسی عصبیت و فرقہ واریت کو جگہ نہ دی جائے۔

اسی طرح مذہب کو ایمانداری کے ساتھ زندگی میں رچایا اور بسایا جائے۔ یہ نہ ہو کہ جب تک مذہب سے فائدہ حاصل ہوتا رہے، اس کو استعمال کیا جاتا رہے اور جہاں اس کا ٹکراؤ

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۲۸۵

اپنے فائدہ اور ذاتی غرض سے ہو اس کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

اللہ پر سچے ایمان کے بغیر مذہب کا نام لینا بے کار ہے ایمان جان لینے اور مان لینے کا نام نہیں ہے بلکہ کسی چیز کا دل میں اتر جانا، بیٹھ جانا، رگ وریشہ میں سرایت کر جانے کا نام ہے، اللہ سے اس قسم کا تعلق قائم ہونے کے بعد تمام کاموں میں اللہ کی مرضی اور اس کے بندوں کی بھلائی معلوم کرنے کی فکر ہوتی ہے جس سے یکجہتی پیدا ہوگی اور ایک ایسا سماج وجود میں آئے گا جس میں ملک وقوم کی بہتری ہو اور ان تمام باتوں اور کاموں سے پرہیز ہو جن میں ایک فرد کا بھی نقصان ہوتا ہو۔ کیوں کہ پیغمبروں نے اللہ اور بندوں کے درمیان جو رشتہ بتایا ہے، وہ یہ ہے۔

الخلق کلھم عیال اللہ	تمام مخلوق اللہ کا کنبہ (خاندان)
فاحبھم الی اللہ انفعھم	ہے جو اللہ کے خاندان کو زیادہ
لعیالہ [1]	نفع پہنچانے والا ہے۔
ان العباد کلھم اخوۃ [2]	سب بندے بھائی بھائی ہیں۔
الناس بنو آدم و آدم	سب لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں
من تراب	اور آدمؑ مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں

پیغمبروں نے بندوں سے اللہ سے محبت کی تاکید کی اور یہ بھی بتایا کہ اللہ سے محبت کا راستہ اس کے بندوں کی خدمت میں ہو کر گزرتا ہے۔ مذہب پر عمل کرنے میں بندوں کی خدمت نظرانداز نہ ہونی چاہیے۔ ورنہ مذہبی ہونے کا سرٹیفکٹ وہاں سے نہ ملے گا جہاں

---

[1] جامع صغیر بحوالہ طبرانی [2] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ [3] مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۶۹ عن زید بن ارقم

سے مذہب آیا ہے۔ پھر اس خدمت میں کسی "ریزرویشن" کی گنجایش نہ ہونی چاہیے کہ وہ سبھی کا اللہ ہے خواہ بندوں کا تعلق کسی فرقہ ومسلک سے ہو۔ اگر فرقہ ومسلک کی تفریق روا رکھی گئی تو مذہبی ہونے کی "سند" خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ "جنریشن گیپ" کے باوجود انفرادی اجتماعی معاشرتی، معاشی تمدنی اور سیاسی زندگی کی رہنمائی مذہب میں موجود ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مذہب کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور اس کی تعلیمات فطری سچائیوں کے موافق دکھائی دیں ایسا نہ ہو کہ تھکی ماندی قوتیں اور کام سے جی چُرانے والی طبیعتیں ایک سایہ دار درخت کے نیچے پناہ لینے کے لیے بیٹھ گئی ہوں اور آگے بڑھنے سے گھبرا رہی ہوں۔

آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ ہم سب کو سچائی کے پروگرام (مذہب) پر سچائی کے ساتھ عمل کی توفیق ہو۔ آمین۔

زمانہ کی شہادت

حضرات! آج ہمارا دوسرا (بقر عید) مذہبی تہوار ہے پہلے ہیں سچائی کا پروگرام پیش کیا گیا تھا آج اس پروگرام کی سچائی پر زمانہ کی شہادت پیش کی جاتی ہے۔

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ط بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

وَالْعَصْرِ ۙ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۙ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

یہ ہدایتِ الٰہی کی چھوٹی سی سورت ہے، جس ہیں انسان کے عکس، قوموں کی تقدیر اور ترقی کے اصول ہر ایک کی جھلک موجود ہے۔ انسان کا عکس جدید دنیا نے بھی لیا ہے اور ہدایت الٰہی بھی عکس لیتی رہی ہے۔ لیکن دونوں ہیں بنیادی فرق یہ ہے کہ جدید دنیا نے جس آئینہ سے لیا وہ کائنات کی عکاسی کے لیے تیار کیا گیا ہے جس ہیں کائنات کی چیزیں بڑی حد تک دیکھ لی گیئں۔ لیکن انسان ہی کا صحیح عکس اس ہیں نظر نہ آسکا۔ دراصل انسان ایک سربستہ راز اور صنّاعی کا بہترین شاہکار ہے۔ اندر کی پُر پیچ راہوں سے گزرنا

باریک تاروں تک پہنچنا اور پھر اندھیری کوٹھری میں روشنی کی کھڑکی دریافت کرنا، آسان کام نہیں ہے۔ انسان وہیں سفر کرسکتا ہے جہاں اس کی توانائی اجازت دیتی ہے۔ اسی منزل تک جاسکتا ہے جس تک عقل ساتھ دے سکتی ہے۔ راہیں اتنی پُرپیچ کہ قدم رکھتے ہی توانائی جواب دے دے۔ تار اس قدر باریک کہ ان کو چھوتے ہی وہ الجھ کر رہ جائیں ایسی حالت میں کیا توقع ہو سکتی ہے کہ انسان خود اپنا عکس لینے میں کامیاب ہو سکے گا۔ بے بسی کی اس صورت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ سمندر کی موجوں سے کھیلنا پہاڑوں کی چھاتیوں کو روندنا اور چاند کی دھرتی پر قدم رکھنا اس کے لیے آسان ہے لیکن نفس کی چھوٹی سی ترغیب اور جذبات کی ادنا سی کشش پر قابو پانا اس کے لیے حد درجہ مشکل ہے۔ ہزار ایجادات کے باوجود عقل کو جذبات پر فتحمند بنانے کے لیے کوئی ایجاد اب تک نہ کر سکا ہزار تدبیروں کے باوجود روح اور حیات کے سرچشمہ کی دریافت میں کامیاب اب تک نہ ہو سکا۔ اور جس کا نتیجہ بقول ڈاکٹر اقبال رح یہ ہے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا

ہدایتِ الٰہی نے انسان کے عکس کے لیے جو آئینہ تیار کیا ہے وہ اصلاً اسی کے لیے ہے۔ کائنات اس کے جلو میں خود بخود آجاتی ہے۔ جو چیزیں انسان کے بنائے ہوئے آئینہ میں دیکھ لی گئیں یا دیکھی جا سکتی ہیں اس میں ہدایت کو دخل دینے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے، چنانچہ وہ یہ کرتی رہی اور اب بھی کر رہی ہے۔ ہدایت الٰہی نے خاص انسان کے لیے جو آئینہ تیار کیا ہے اس میں انسان کی اصلیت نورانی نظر آتی ہے اس میں وہ نورانی موتی بھی نظر آتے ہیں جو نیچرل کانسٹی ٹیوشن (Natural constitution) میں ٹکے ہوتے ہیں وہ مخفی تار بھی دکھائی دیتے ہیں، جو انسان کے شعور و تحت الشعور میں پیوست ہوتے ہیں، اور جن کا ربط ایک ذی شعور طاقت سے ہے۔ تاروں کے وہ زیر و بم بھی دکھائی دیتے ہیں جن کے بغیر زندگی کے ساز میں سوز نہیں پیدا ہوتا اور بہت سے نغمے خاموش رہ جاتے ہیں اور اندھیری کوٹھری میں روشنی کی وہ کھڑکی بھی نظر آتی ہے۔ جس کے ذریعہ عقل سے پرے، پرواز کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

ھی کوۃ من عالم القدس روح عالم قدس کی جانب کھڑکی ہے

مذکورہ آیت جو پڑھی گئی ہے وہ اسی ہدایت الٰہی کی ہے جس میں انسان کا بے کم وکاست عکس لیا گیا اور جس کی حفاظت و صحت کی ضمانت کا اس قدر اہتمام و انتظام کیا گیا کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ترجمہ یہ ہے:

"زمانہ شاہد ہے کہ انسان خسارے میں ہے سوائے

ان کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کیے اور آپس
میں ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی اور ایک
دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔"

"والعصر" میں "واو" قسم کے لیے ہے اور عصر کے معنیٰ زمانہ ہے ہدایت الٰہی میں اس طرح کی قسمیں تمام تر اس دعوے کے لیے دلیل اور شہادت کی حیثیت رکھتی ہیں جو قسم کے بعد ذکر کیا جاتا ہے۔ سورت میں انسان کو خسارہ سے بچانے کے لیے جو چار اصول ہیں ان کی صداقت اور سچائی کے لیے پوری تاریخ کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے۔

پہلا اصول ایمان ہے۔

ایمان جان لینے اور مان لینے کا نام نہیں ہے، بلکہ قرآن کی اصطلاح میں اس حقیقت کا نام ہے جس کی تعبیر ہم اپنی زبان میں "دل میں اُتر جانا، رگ و ریشہ میں سرایت کر جانا" سے کرتے ہیں۔

یہ بے جان تصدیق اور جامد عقیدہ کا نام نہیں ہے بلکہ علم و عقیدہ اور معرفت و محبت کے حسین امتزاج سے قلب و ذہن کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان اپنی خواہش اپنی مرضی حتیٰ کہ اپنی ذات کو اس کی مرضی اور ارادہ پر چھوڑ دیتا ہے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔ اس کا تعلق اندرونی زندگی سے ہے جہاں سب سے پہلے اصلاح و انقلاب کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ اور جہاں افکار و احساسات اور تصوّرات کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کسی اصلاح و انقلاب کے لیے

جب اندرونی زندگی کی فضا سازگار ہوگئی تو (بیرونی زندگی) کے تمام مراحل آسانی سے طے ہوتے رہتے ہیں۔

عمل صالح سے مراد چند ظاہری مراسم و اعمال اور چند رواجی نیکیاں نہیں ہیں بلکہ اس کا قرآنی مفہوم اخلاقیت و مادّیت کے ہر شعبے کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ البتہ پہلے کی حیثیت بنیاد کی ہے کہ اس کے بغیر نہ صالح معاشرہ وجود میں آتا اور نہ عالمی تصرّفات انسانیت کے لیے مفید بنتے ہیں۔

کلام عرب میں صالح کا لفظ جس کام کے سلسلے میں بولا جاتا ہے اس کی مناسبت سے صلاحیت اور موافقت مراد ہوتی ہے۔ قرآن و سنت اور مفسّرین کے اقوال سے بھی موقع کی مناسبت سے صالح کے مفہوم میں عمومیت اور وسعت کا ثبوت ملتا ہے۔

تیسرا اصول "تواصی بالحق" ہے۔

تواصی وصیت سے بنا ہے جس میں ذمہ داری و نگرانی ایثار و قربانی باہمی شرکت و تعاون جذبہ و اسپرٹ اقدام و عزم سب ہی ملحوظ ہیں۔ حق کے معنیٰ ثبوت اور قیام کے ہیں۔ کلام عرب میں یہ جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے، وہاں ثبوت، قیام، نہ ٹلنا، نہ ہٹنا وغیرہ مفہوم کا پایا جانا یقینی ہے۔ مفسّرین کے اقوال سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے مثلاً وہ بات جس کا واقع ہونا قطعی ہو، وہ بات جو عقل کے نزدیک مسلّم ہو، وہ بات جو اخلاقاً فرض ہو۔

چوتھا اصول "تواصی بالصبر" ہے۔

صبر ایک منفی قوت نہیں بلکہ زبردست مثبت قوت ہے جس سے

اصلاح و انقلاب میں مدد لی جاتی، ظرف کی کمی و بیشی کی نشاندہی ہوتی اور زندگی کے مقام و مرتبہ کا پتا لگایا جاتا ہے۔ مطالبات و فرائض کی ادائیگی پر صبر، مرغوبات و مفادات کے ترک پر صبر، مشکلات و مصائب پر صبر۔

ان چاروں کی تشریح اس طرح بھی کی جاتی ہے۔

(۱) ایمان

جن نظریات پر کسی قوم کی تنظیم ہوئی ہو وہ افراد، جماعت کی رگ رگ میں سمائے ہوئے ہوں اور ان کی پوری زندگی پر چھائے ہوئے ہوں۔

(۲) عمل صالح

ان نظریات کو بروئے کار لانے کے لیے جن جن تدبیروں اور صلاحیتوں کی ضرورت پڑے اور جس جس قسم کی اطاعت و فرماں برداری کا مطالبہ کیا جائے، اس کے لیے قوم کے افراد ذاتی مفاد کو نظر انداز کر کے ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہیں۔

(۳) تواصی بالحق

قوم کا ہر فرد قولی اور عملی طور پر ان نظریات کا مبلّغ ہو اور ایک دوسرے کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہو۔

(۴) تواصی بالصبر

قوم کے افراد عزم و استقلال کے ساتھ مطالبات و فرائض اور مصائب و مشکلات میں ثابت قدم رہیں اور آگے بڑھنے کا جذبہ سرد نہ ہونے پائے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:
" علم کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ و، علم مومن کا دوست ہے، حلم (بُردباری) اس کا وزیر ہے، عقل اس کی رہبر ہے، نرم خوئی اس کا بھائی اور صبر اس کے لشکر کا امیر الامرا (کمانڈر انچیف) ہے۔
(نوادر الاصول از تفسیر عزیزی)

یہ چار اصول ہیں جن میں قوموں کی تقدیر چھپی ہے۔

چوں سرمۂ افرنگی از دیدہ فرو شستم
تقدیر امم دیدم پنہاں بکتاب اندر

اصل عبادت ان کا کہنا ماننا ہے

حضرات! آج ہماری عید ہے جس کو مذہبی تقریبات میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عید منانے کا دستور ابتدا ہی سے چلا آرہا ہے جس سے اس کی فطری حیثیت متعین ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد نے اس دن عید منائی جس دن اللہ نے آدمؑ کی دعا قبول فرمائی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم میں اس دن عید ہوئی جس دن اللہ نے ابراہیمؑ کو نمرود کی آگ سے نجات دی تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم میں وہ دن عید کا ہوتا جس میں یونسؑ اللہ کے حکم سے مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں اس دن عید ہوتی تھی جس دن موسیٰؑ کو فرعون اور اس کے لشکر پر اللہ نے فتح دی تھی حضرت عیسیٰؑ کے معتقد بن اس دن عید مناتے تھے جس دن اکثر مفسّرین کے قول کے

مطابق) ان کے لیے آسمان سے سجا سجایا کھانے کا دستر خوان اترا تھا چنانچہ قوم کی فرمایش پر حضرت عیسیٰؑ کی درخواست قرآن حکیم میں بھی مذکور ہے، اور اس میں عید کا لفظ موجود ہے وہ یہ ہے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا	اے اللہ اے ہمارے پروردگار
مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ	ہمارے لیے آسمان سے دستر خوان
لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا	اُتار دیجیے کہ وہ ہمارے لیے ہمارے
وَاٰيَةً مِّنْكَ [1]	اگلوں پچھلوں کے لیے عید ہو اور
	آپ کی طرف سے ایک نشانی ہو۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں بھی دو تہوار نوروز اور مہرجان بڑی دھوم دھام کے ساتھ منائے جاتے تھے جن میں جوئے شراب، اور فسق و فجور کی محفلیں گرم ہوتی تھیں انھیں دیکھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

قد اعطى الله بهما خيرا	اللہ نے ان دونوں کے بدلے
منهما يوم الاضحى ويوم	ان دونوں سے بہتر عید اور
الفطر (ابوداؤد و مشکوٰۃ شریف باب صلوٰۃ العیدین)	بقر عید عطا فرمائے۔

پچھلی قوموں کی عید کے لیے جو دن تجویز ہوئے وہ کسی خاص انعام واکرام یا قومی فتوحات کے دن تھے لیکن ہماری عید کے لیے جو دن تجویز ہوئے وہ ریاضت و مجاہدہ، صبر وضبط اور ایثار وقربانی کی آزمایش کے اختتام پر ہیں۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ بندہ بھوک و پیاس اور گرمی کی شدت سے نڈھال یہ کہ کر اپنی ڈھارس

---

[1] سورہ مائدہ۔

باندھ رہا تھا۔

اِلٰھی انت مطلوبی — اے اللہ آپ ہی میرے مطلوب

ورضاکٔ مقصودی — ہیں اور آپ ہی کی رضا مقصود ہے

آج اس آزمایش کے ختم ہونے پر اللہ اس کے جواب میں فرشتوں کو گواہ کر کے فرماتا ہے۔

رضائی و مغفرتی — میری رضا میری طرف سے مغفرت

یعنی تمھارا مطلوب و مقصود حاصل ہو گیا جس کی خاطر تم اب تک آزمایش سے دوچار رہے۔

ایک مہینے تک جہاں سے بھوک، دپیاس اور صبر و برداشت کی ہدایتیں جاری ہوتی رہیں وہیں سے آج کھانے پینے اور عید منانے کے آداب و احکام جاری ہو رہے ہیں. اصل یہ ہدایتیں اور آداب و احکام ہیں اگر یہ نہ ہو تو نہ روزہ روزہ ہے اور نہ عید عید ہے، روزہ میں جس قدر عبادت نظر آتی رہی اسی طرح عید میں جس قدر مذہبی چہل پہل دکھائی دے رہی ہے وہ سب انھیں ہدایتوں اور حکم واحکام کی بنا پر ہے ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ نہ روزہ رکھنا عبادت ہے اور نہ روزہ نہ رکھنا عبادت ہے بلکہ اصل عبادت ان کا کہنا ماننا ہے، جب انھوں نے روزہ رکھنے کے لیے کہا تو اس وقت روزہ رکھنا عبادت ہے (جیساکہ ایک مہینا پورا گزر چکا) اور جب روزہ نہ رکھنے کے لیے کہا تو اس وقت روزہ نہ رکھنا عبادت ہے۔ بلکہ روزہ رکھنا حرام ہے جیسے کہ آج کا روزہ۔ اگر تعمیل حکم کی بات نہ ہوتی تو آج کے روزہ میں زیادہ ثواب ہونا چاہیے کہ آج عید کا

دن ہے۔

آج کی ہماری عید میں دو کاموں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

(۱) ایک اللہ کے دربار میں شکرانہ۔

(۲) اور دوسرا بندوں کی خدمت میں نذرانہ۔ شکرانہ اللہ کے حضور نماز کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس نے مہینے بھر تک بھوک و پیاس کی شدّت اور خواہشِ نفس کی مخالفت عطا فرمائی کہ یہاں سب کچھ اسی کی توفیق کا نتیجہ ہے۔

مری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

نذرانہ بندوں کی خدمت میں صدقۂ فطر کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنی عبادت و بندگی اور شکرانہ سے اس وقت تک خوش نہیں ہوتا جب تک اس کے بندوں کی خدمت میں نذرانہ نہ گزارا جائے چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کی مذہبی تعبیر یہ بیان کی ہے۔

"روزے آسمان وزمین کے درمیان اس وقت تک معلّق رہتے ہیں جب تک صدقۂ فطر نہ ادا کیا جائے"

بندوں کے سلسلے میں اللہ کا احساس حد درجہ نازک ہے وہ نہیں چاہتا کہ مسرت و شادمانی کے موقع پر اس کے بندے بھوکے اور ضروریات زندگی سے محروم رہیں۔ بندوں سے اس کو بے حد محبت ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الخلق کلھم عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن عیالہ (مشکوٰۃ باب الشفقہ)

تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اللہ کو زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ احسان کرے۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (جو بڑے پایہ کے بزرگ گزرے ہیں) فرماتے ہیں۔

"فرشتوں کے کام میں جو تمہیں یکسانی نظر آتی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ حدیث محبّت کے مخاطب نہیں اور انسانوں کے راستے میں جو نشیب و فراز نظر آتے ہیں وہ اس وجہ سے ہیں کہ ان کے ساتھ محبت کا معاملہ ہے 'یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ' — "اللہ ان سے محبت کرتا ہے وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔"

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

"جب اللہ کو منظور ہوا کہ اس خاکی پتلے کو وجود کا لباس پہنائے اور خلافت کے تخت پر بٹھائے تو فرشتوں نے عرض کی "آپ زمین میں ایک ایسی مخلوق کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں جو اس میں فساد برپا کرے گی" "لطف قدیم" نے جواب دیا کہ محبت میں مشورہ نہیں ہوتا۔ اور عشق و تدبیر جمع نہیں ہوتے اگر ہمیں قبول نہ ہو تو تمہارے سبحان اللہ اور الحمد للہ کہنے کی کیا قیمت ہے اور اگر ہمارے لطف و عنایت کا ساقی عفو و معافی کا پیمانہ انسانوں کے ہاتھ پر رکھ دے تو ان کو گناہوں سے کیا نقصان ہو گا۔ تم یہ تو دیکھتے ہو کہ

معاملات میں وہ ہم سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے ہو کہ محبت میں ہم ان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

واذا الحبیب اتیٰ بذنب واحد
جب محبوب سے ایک گناہ سرزد ہوتا ہے

جاءت محاسنہ بالف شفیع
تو اس کے محاسن ہزار سفارشی کھڑے کردیتے ہیں

آخر میں ایک حدیث ذکر کی جاتی ہے جو کافی دن ہوئے ایک مسلم ملک کے عیدی کارڈ میں چھپی ہوئی نظر سے گزری تھی۔ اس سے مسلمانوں کی زندگی کا رخ متعین ہوتا اور عیش و آرام کا وہ تصور نہیں باقی رہتا جو دوسروں میں پایا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ یہ باتیں فرماتا ہے۔

میں نے پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں میں رکھ دیا ہے لوگ انھیں باہر تلاش کرتے ہیں وہ کیسے پائیں گے؟

(۱) میں نے اپنی رضا کو نفس کی مخالفت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے نفس کی موافقت میں تلاش کرتے ہیں وہ کیسے پائیں گے؟

(۲) میں نے آرام کو جنت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں وہ کیسے پائیں گے؟

(۳) میں نے علم و حکمت کو بھوک[1] میں رکھ دیا ہے لوگ اسے سیری میں تلاش کرتے ہیں وہ کیسے پائیں گے؟

---

[1] بھوک عام لفظ ہے جس میں پیٹ ہی کی بھوک نہیں بلکہ حسب حال ہر بھوک شامل ہے۔

(۴) میں نے مال داری کو قناعت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے مال میں تلاش کرتے ہیں وہ کیسے پائیں گے؟

(۵) میں نے عزت کو اپنی فرماں برداری میں رکھ دیا ہے لوگ اسے بادشاہوں کے درباروں میں تلاش کرتے ہیں وہ کیسے پائیں گے؟

نورانی فرمان

اللّٰہُ اکبر اللّٰہُ اکبر لا الٰہ الا اللّٰہ، واللّٰہُ اکبر اللّٰہُ اکبر وللّٰہ الحمد
اِنّی وَجَّہتُ وَجہِیَ لِلّذی فطر السمٰوٰتِ والارض حنیفا وما انا من المشرکین
اِنّ صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ ربّ العٰلمین، لا شریک لہٗ
وبذٰلک اُمرتُ وانا اوّل المسلمین۔

حضرات! یہ ذی الحجہ کا مہینا ہے جو ہر سال آتا ہے اور اس نورانی فرمان کو یاد دلاتا ہے جو نویں ذی الحجہ کو ۱۴ سو سال پہلے نشر کیا گیا تھا اور صدائے ربانی بن کر فضائے عالم پر چھا گیا تھا یہ فرمان ایک طرف انسان کی شرافت وعظمت کی ضمانت دیتا ہے تو دوسری طرف سماج کی قدر و منزلت کا تعین کر کے اس کی ترقی کی راہیں ہموار کرتا ہے۔

عرفات کے میدان میں لاکھوں کا مجمع تھا۔ سب لوگ دربار کی حاضری کی وردی (احرام) میں ملبوس تھے۔ امیر، غریب، شاہ گدا، بوڑھے، جوان، تندرست و توانا، ضعیف و بیمار، ایرانی و تورانی، عربی و عجمی، کالے، گورے، سب ایک ہی لباس میں تھے اور سادگی و دلکشی میں اپنی مثال آپ تھے۔ یہ دلکشی صرف ظاہری

لباس سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ اس کے لیے باطنی لباس کی ضرورت ہے جس سے وہ مجمع آراستہ تھا اور جس کا نقشا اس طرح کھینچا گیا ہے۔

أبرّهم قلوبا اعمقهم علما اقلّهم تکلّفا ؎۱	وہ دل کے نیک تھے علم میں گہرے تھے زندگی میں سادہ تھے۔

اس نورانی فرمان میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انسان اور سماج کی قدر و منزلت واضح کرنے کے بعد ان خرابیوں کی نشاندہی کی ہے۔ جو دونوں کے دامن پر بدنما داغ اور ان کی ترقی میں سنگ گراں بن کر حائل ہوتی ہیں۔ اس کی بہت سی دفعات ہیں چند کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) أیّھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمیّ علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الاّ بالتقوی ؎۲	اے لوگو غور سے سُن لو۔ بیشک تمھارا رب ایک ہے تمھارا باپ ایک ہے یاد رکھو عربی کو عجمی (غیر عربی) پر عجمی کو عربی پر گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں صرف تقوے و کردار کی بنا پر فضیلت ہے۔

حسب و نسب ذات پات شرافت و رذالت کے جو معیارات انسانی سماج میں پائے جاتے رہے ہیں اور بگڑے ہوئے مذہب اور ان کے نمایندوں کی پشت پناہی ان کو حاصل رہی ہے وہ سب غیر اختیاری

۱؎ مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ۲؎ مسند احمد

ہیں جن میں انسان کے کسب دریاضت کو کوئی دخل نہیں ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی طرف سے جو معیار مقرر کیا ہے، وہ اختیاری ہے جو کسب دریاضت سے حاصل ہوتا ہے وہ تقوے اور کردار کا معیار ہے جو علم وعمل دونوں کو شامل ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے یہ خرابی یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اپنے اپنے حلقے اور خاندان سے باہر خدا کی آواز بھی سننے کے لیے تیار نہ تھے چنانچہ ہندستان میں آریہ ورت سے باہر خدا کی آواز نہ سنائی دیتی تھی یہی حال دوسری جگہ کا تھا۔ آج کی ہماری مذہبی حلقہ بندی وخاندان بندی دوسرے کو نظر انداز کرکے جس انداز سے حلقہ وخاندان کی فوقیت ثابت کررہی ہے ڈر لگتا ہے کہ آگے چل کر کہیں آریہ ورت والی شکل واپس نہ آجائے اللہ مسلمانوں کو اس فتنۂ عظیم سے محفوظ رکھے آمین۔ غلام اس وقت کے سماج میں نہایت گرے ہوتے تھے کہ آج کی دنیا میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس قدر اونچا اٹھایا کہ غلامی آقائی میں تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ ان کے بارے میں فرمایا۔

ارقاءکم ارقاءکم اطعموھم	تمھارے غلام تمھارے غلام۔ جو
مما تاکلون واکسوھم	خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ۔ جو خود
مما تلبسون [1]	پہنو وہی ان کو پہناؤ۔

عورت ہمیشہ عورت رہی زمانہ اس کے ساتھ ہر دور میں ستم ظریفی کرتا رہا اس کی قسمت کے فیصلے کبھی اس کے ہاتھ میں نہ رہے بلکہ مرد ہی اس کے فیصلے کرتے رہے۔

---

[1] ابن سعد۔

اب جب اس نے اپنے ہاتھ میں اپنی قسمت کے فیصلے لینے چاہے تو وہ ردّ عمل (Reaction) کی نفسیات کا شکار ہے جس سے ہمدردی کے انداز میں مرد ہی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خاص طور سے اس فرمان میں مردوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

فاتقوا اللہ فی النساء [۱] عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔

ان لکم علی نسائکم حقا ولھن علیکم حقا [۲]

خاندانی دَل بدَلی کا رواج آج کی طرح پہلے بھی تھا۔ جہاں کوئی موڑ آیا یا مفاد وابستہ ہوا فوراً خاندان بدل کر اپنے کو دوسرے کی طرف منسوب کر دیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس نورانی فرمان میں ایسے شخص پر لعنت فرمائی ہے جو ممانعت کی سخت ترین شکل ہے۔

من ادّعی الی غیر ابیہ و انتمی الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ [۳] جو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعوا کرے اور جو غلام اپنے آقا کے سوا کسی اور کی طرف اپنی نسبت کرے اس پر اللہ کی لعنت ہے۔

مذہب کے نام پر اوہام و خرافات اور رسم و رواج سے پورا سماج جکڑا ہوا تھا جس کی بنا پر انسان کی صلاحیتیں پامال ہو رہی تھیں اور ان کو بروئے کار لانے کے راستے تنگ سے تنگ ہو گئے

---

[۱] مسلم، ابو داؤد [۲] طبری، ابن ہشام وغیرہ [۳] ابن ماجہ، ابو داؤد وغیرہ

تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

الاکل شیٔ من امر الجاھلیۃ	یاد رکھو جاہلیت کے تمام رسوم
تحت قدمی موضوع ؎۱	میرے دونوں پانو کے نیچے ہیں

یہ صورت بیشتر مذہب پر عمل کرنے میں غلو و مبالغہ سے پیدا ہوتی ہے چنانچہ اسی موقع پر آپ نے فرمایا۔

ایاکم والغلو فی الدین	مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو
فانما اھلک قبلکم الغلو	کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی سے
فی الدین ؎۲	ہلاک ہو گئی ہیں۔

سرمایہ دارانہ ذہنیت عام تھی۔ ہر بڑا چھوٹے کے لیے درندہ بنا ہوا تھا۔ سودی کاروبار کے جال میں سب پھنسے ہوئے تھے جس انسان کو اللہ نے آزاد پیدا کیا ہے سرمایہ داری اور اس کے نمایندہ سود نے اس کو پا بہ زنجیر بنا رکھا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس نورانی فرمان میں سودی کاروبار کی حرمت کا اعلان کرکے انسان کو سرمایہ دار درندوں سے آزاد کرایا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔

ربا الجاھلیۃ موضوع ؎۳	جاہلیت کے تمام سود باطل قرار دیے جاتے ہیں۔

انسان محترم ہے جان و مال اور صلاحیت کی حفاظت اس کا سماجی حق ہے لیکن خاندانی رقابت و انتقامی جذبہ نے اس کو اپنے تمام حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمام رکاوٹوں کو دور کرکے ہر صاحبِ حق کو اس کا حق دلایا۔

؎۱ مسلم و ابوداؤد ؎۲ ابن ماجہ و نسائی ؎۳ مسلم ابوداؤد

ان دماءکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمة یومکم ھذا فی شہرکم ھذا فی بلدکم ھذا الی یوم تلقون ربکم [۱]	تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو قیامت تک اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ دن اس مہینے اور شہر میں محترم ہے۔

اور فرمایا۔

ان اللہ عزوجل قد اعطی کل ذی حق حقہ الخ [۲]	اللہ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا۔

اس نورانی فرمان کی بہت سی دفعات ہیں جو حدیث و سیر کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ سب سے آخر میں آپ نے فرمایا۔

اعبدوا ربکم وصلوا خمسکم وصوموا شہرکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنة ربکم [۳]	اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو پانچوں وقت کی نماز پڑھو مہینے کا روزہ رکھو جب حکم دوں تو اطاعت کرو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔

فرمان مکمل ہونے کے بعد آپ نے لوگوں سے پوچھا۔

الاھل بلّغت	کیوں میں نے اللہ کا فرمان پہنچا دیا

سب نے اس کا جواب اثبات میں دیا کہ بے شک آپ نے بے کم و کاست پہنچا دیا۔ پھر آپ نے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

اللھم اشھد	اے اللہ آپ گواہ رہیے

اس وقت کا منظر کس قدر عجیب تھا کہ ایک طرف اللہ کا رسول

---

[۱] بخاری مسلم ابوداؤد وغیرہ [۲] ابن ماجہ و ابوداؤد وغیرہ [۳] مسند احمد و حاکم وغیرہ

صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اپنا گواہ بنا رہا تھا اور دوسری طرف اللہ کو اس گواہی پر گواہ بنا رہا تھا کبھی شہادت کی انگلی سے مجمع کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور کبھی اللہ کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ آپ ان کی شہادت پر گواہ رہیے۔

ان سب مراحل سے گزرنے کے بعد لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

فلیبلغ الشاھد الغائب — جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان کو پہنچا دیں جو موجود نہیں۔

مجمع میں موجود لوگوں نے اس ہدایت پر یہاں تک عمل کیا کہ دنیا کے کونے کونے تک اس فرمان کو پہنچا یا پھر بعد میں جس خطہ میں اور ملک میں بھی سماجی اصلاح یا انقلاب کی شکل رونما ہوئی وہ اس فرمان کے پر تو سے بے نیاز نہ ہو سکی۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پودا سی کی لگائی ہوئی ہے